جلد ۱۰۱ اگست ۱۹۸۴ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۱ | اگست ۱۹۸۴ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ———— ۴۱-۳۱۶

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ماہ اگست آتا ہے تو ہمارے دلوں میں خوشی کی ایک لہر اُس دن (۱۴ اگست) کو یاد کر کے دوڑ جاتی ہے جس دن ہم انگریزی استعمار کے ساتھ ہی غیر ہندو امپریلزم سے آزاد ہوتے تھے، اس پر اللہ کا ہزار در ہزار شکر!

مگر کیا کبھی ہم نے سوچا کہ آزادی ہے کیا؟

دُنیا میں کتنی ہی قومیں ہیں جو آزادی کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دے کر لمبی جد و جہد کرتی ہیں اور نتیجۃً وہ کسی غیر قوم کے سیاسی تسلط سے نکل آنے پر اس تصور سے سرشار ہو جاتی ہیں کہ ہم آزاد ہو گئے۔ اور پھر ہر سال اس آزادی کے جشن مناتی ہیں۔ مگر ان کو اس تلخ حقیقت کا شعور نہیں ہوتا کہ وہ ہنوز کچھ اور معنوں میں غلام ہیں۔ کتنی ہی زنجیریں اور بیڑیاں ہیں جنہوں نے ان کو جکڑ رکھا ہے۔ مگر کم ہی افراد کو ان زنجیروں اور بیڑیوں کو توڑ کر حقیقی اور مکمل آزادی کے لیے جد و جہد کرنے کا خیال آتا ہے۔ بلکہ اُلٹا ستم یہ ہوتا ہے کہ خود نو آزاد قوموں کے اندر ہی ایسے مضبوط عناصر اور منظم طبقے موجود ہوتے ہیں جو اُن زنجیروں اور بیڑیوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو کوئی ان کے خلاف زور لگائے یا آواز اُٹھائے اسے تخریب کاری اور انتشار انگیزی کا الزام دے کر سماجی اور ذہنی دباؤ سے ہی نہیں، حکومتی قوت و قانون سے کچل دیتی ہے۔ بہت سی زنجیریں اور بیڑیاں تو وہ ہوتی ہیں جو خود ہمارے ذہنوں سے اُگ کر بیل کی طرح ہمارے گرد لپٹتی جاتی ہیں۔

کسی بھی حقیقت پسند قوم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ بیرونی سیاسی اقتدار سے آزادی حاصل

کرنے کے معنی آزادی کی راہ پہ پہلا قدم رکھنے کے ہیں اور اس مقام سے مکمل اور حقیقی آزادی کے مشکل تر سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

خاص طور پر جن قوموں کا وجود نظریاتی، اعتقادی اور تہذیبی ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک اپنے آپ کو پوری آزادی پہ فائز نہیں سمجھتیں جب تک وہ اپنے اعتقادی و تہذیبی اُصولوں پر اپنی اور معاشرے کی زندگی کا امتحان کا انتظام نہ کرلیں۔ جن قوموں کی کوئی تاریخ ہوتی ہے وہ اپنی تاریخ کے زریں دور کا احیا چاہتی ہیں۔ جن کی کوئی روایات ہوتی ہیں، وہ اپنی روایات کو زندہ کرنے سے پہلے اپنے وجود کو آزاد محسوس نہیں کرتیں۔ جن کے پاس خیر و فلاح کے معیارات ہوتے ہیں، وہ ان معیارات کو تازہ کرنے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں۔ جن کے پاس کوئی اخلاقی قدریں اور ثقافتی شعار موجود ہوتے ہیں، وہ ان کو نئی زندگی دینے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ ایسی قوموں یا معاشروں کے نزدیک ہر وہ صورت غلامی کی صورت ہے جو اس امر میں مانع ہو کہ وہ اپنے محبوب نظامِ تہذیب کو رُو بہ عمل لاسکیں۔ انگریزوں سے ہمارا جھگڑا صرف معاشی مفاد ہی کا جھگڑا نہ تھا کہ وہ ہمارے مال کی دولت کو نچوڑ کر لے جا رہے ہیں بلکہ اس کے سامنے نہایت آتشیں جذبات کو رو بہ عمل لانے والا یہ سانحہ بھی تھا کہ ہمارے عقائد، ہمارے اخلاقی معیارات اور ہماری تہذیب کی درخشاں قدروں کو سامراج ملیامیٹ کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی سامراج کے خلاف جتنی تحریکات —— تحریکِ مجاہدین، تحریکِ ہجرت، تحریک ۱۸۵۷ء، تحریک خلافت، جمیعت العلما، مجلس احرار اور مسلم لیگ —— برپا ہوئیں، ان کا غالب ترین داعیہ دینی تھا۔

پھر جلد ہی وہ وقت بھی آگیا کہ مسلمانوں کے ذہین اور مدبر اکابر نے یہ محسوس کرلیا کہ انگریز (جس کی پالیسی شروع سے مسلمانوں کے خلاف انتقامی تھی) اپنے زیرِ سایہ خوفناک ہندو سامراج کو پال پوس کر اس امر کے لیے تیار کر رہا ہے کہ جب وہ خود رخصت ہونے پہ مجبور ہو جائے تو سارا در و بست اس نوخیز سامراج کے حوالے کر دے جو اپنی

چکی میں مسلمانوں کو محض اس جرم کی سزا دینے کے لیے پیس ڈالے کہ وہ ایک جداگانہ نظریۂ حیات اور نظامِ تہذیب رکھنے کی وجہ سے ہندو سوسائٹی میں اکھنڈ سیکولر بھارت کے دروازے سے داخل ہونے پر تیار نہیں۔

مگر کوتاہ اندیش اور جلد باز متعصب ہندو" چانکیائیت" اپنے گھناؤنے چہرے کو تھوڑی دیر کے لیے بھی چالاکی کے فریب ناک پردے تک میں نہ چھپا سکی، بلکہ آزادی سے ذرا قبل کانگریس کو جب وزارتیں بنا کر حکومت کرنے کا عارضی موقع ملا تو فوری طور پر ودیا مندر اور ودیا مندر کے نام سے دو تعلیمی اسکیمیں ایسی نافذ کر دیں جو نہ صرف اسلامی عقاید و تہذیب کے خلاف تھیں بلکہ ہندو طلبہ کے ساتھ مسلمان بچوں پر بھی ہندو تہذیب اور ہندی زبان کو مسلط کرنے کا ذریعہ تھیں۔ ہندوؤں کی مسلم دشمن سامراجی ذہنیت جتنی زیادہ آشکارا ان سکیموں کے ذریعے ہوئی اتنی بہت سے پڑھے لکھے مسلمانوں پر بھی پہلے واضح نہ تھی۔ یہاں سے مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے تہذیبی غلامی مسلط کرنے کا گہرا احساس ہوا اور جو رَو متحدہ ہندوستانی قومیت کے خلاف چل رہی تھی وہ پورے زور پر آگئی۔

اس دور کی تاریخ کو یاد دلانے کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے اپنے تہذیبی وجود کے احیاء کا ارادہ رکھنے کی وجہ سے ہندوؤں کے تہذیبی تسلط میں جانے سے انکار کیا اور دو قومی نظریے کے تحت آزاد مسلم مملکت کے مطالبے کا علم پوری طرح بلند کر دیا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی سامراج سے نکل کر اور ہندوؤں کی تہذیبی غلامی سے بچ کر اپنے اسلامی تہذیبی وجود کے احیا کا جو ارادہ کیا تھا، حالات آزادی کے بعد تیزی سے اس کے خلاف کام کرتے چلے گئے۔ آیئے ذرا غلامی کی ان نوعیتوں کا جائزہ لیں جس میں ہم مبتلا ہیں:

ا ــــ ہمارا ایک قفس تو وہ ہے جو ہم نے اپنے گرد خود بنایا ہے اور ہم اپنی اس تخلیق سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہیں۔ ہماری بے لگام خواہشات، ہماری اندھی دولت پرستی

ہمارے ضرر رساں اخلاقی رویّے، ہماری مروّجِ عام قانون شکنیاں اور غیر شائستہ حرکات، سماجی مرتبہ بڑھانے کی مسابقت، عہدہ و جاہ کی ہوس ـــــ اور ان وجوہ کے تحت حرام خوری، حرام کاری، خیانت، تشدّد اور جرائم کی کثرت، ان سب آہنی تیلیوں سے مل کر ہمارا خود تخلیق کردہ قفس بنا ہے۔ اِس قفس میں رہتے ہوئے بھی ہم پندارِ آزادی رکھتے ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے قفس کا مضبوط محافظ ہے۔

۲ ـــ دوسری غلامی مخالفانہ نظریات اور تحریکوں سے مسحوریت، ان کی حفاظت، ان کی تبلیغ اور ان کے استحکام کا جذبہ ہے۔ ہم اس وقت بھی جس ملغوبہ تہذیب کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں، اس کا سب سے بڑا اور غالب جزو وہی مغربی طور طریقے ہیں، جن کو جب انگریز نے ہم پر غلامی و بے بسی کے عالم میں مسلط کیا تھا تو وہ ہماری نگاہوں میں بہت مبغوض تھے۔ اس کے ساتھ ہندو تہذیب و معاشرت کے اجزا ابھی ہماری عادات اور تقاریب میں شامل ہیں، لیکن اس غلامی کے خلاف مؤثر جذبۂ نفرت اور داعیۂ انقلاب بڑے پیمانے پر کارفرما نہیں ہے۔ ہم نے اس غلامی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔

۳ ـــ ثقافت، آرٹ اور کلچر کے نام سے مخالفِ ایمان و اخلاق مظاہر کا زور ہے۔ تعلیم ہو یا علوم، نصابی مواد ہو یا پروپیگنڈا لٹریچر، فلمیں ہوں یا کیسٹ، زیرِ زمین پھیلنے والا زہریلا لٹریچر ہو یا فٹ پاتھوں پر بکنے والی عریاں تصاویر، ایک زوردار بوچھاڑ ہے ہمارے تصورِ حیات اور تصورِ اخلاق اور تصورِ انسانیت کے خلاف۔ ترقی کا مفہوم ہمیں دوسروں نے متعین کر کے دیا ہے، انسانیت کا بہترین معیار مقرر کرنے والے ہمارے سیاسی و تہذیبی دشمن اور انسانیت کی قدروں اور شرافت و شائستگی کے اصول سکھانے والے استاد ہمارے دین و تہذیب کے شدید مخالف ہیں۔

۴ ـــ بڑی استعماری طاقتوں نے ہمارے گرد مضبوط گھیرا ڈال رکھا ہے۔ وہ ہماری اجناس ہم سے سستی حاصل کر کے اپنی مہنگی مصنوعات (جن میں سامانِ آرائش اور دوسری بے شمار اسرافیات شامل ہیں) ہماری منڈیوں میں فروخت کرتی ہیں۔ ہم ان کے تیار کردہ "ماہرین" کے لیے بھی بہترین مارکیٹ ہیں۔ وہ ہمیں بین الاقوامی اداروں اور کانفرنسوں میں بھی استعمال

کرتی ہیں اور ہمارے حقیقی ایمانیات کے سیاسی و معاشی تقاضوں کو سامنے آنے سے روکتی ہیں۔ وہ ہمیں اسلحہ نہ دے کر جس کو جس سے چاہیں لڑا دیتی ہیں اور اسلحہ روک کر جس سے جس کو چاہیں پٹوا دیتی ہیں۔ وہ "ایڈ" کے ساتھ اپنے تہذیبی رنگ ڈھنگ کو ہمارے اندر پھیلانے کے علاوہ ہمیں اسلامی تہذیب کے احیا سے روکتی ہیں اور ہمارے اندر سے جو قوتیں ایسے کسی مقصد کے سامنے کام کرتی ہیں، ان کو وہ ہمارے ہی بالادست طبقوں اور حکومتوں کے ذریعے پسوا دیتی ہیں۔ ہر حال میں ان کی کوشش یہ ہے کہ فکری، مالی اور دفاعی حیثیت سے، بلکہ پروپیگنڈے کے میدان میں بھی ہم اپنے پیروں پر نہ کھڑے ہو سکیں۔ وہ ہمارے ہاں جاسوسی کرتی ہیں اور وہ ہمارے آدمیوں کو خرید کر کام میں لاتی ہیں۔

کیا اس حالت کا نام آزادی ہے؟

ہمارے لیے حقیقی آزادی کے ظہور کے چند معین معیارات ہیں:

ایک یہ کہ ہمارا نظامِ تعلیم مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفوں اور نظریوں سے آزاد ہو کر کیا ہمارے اپنے اصولوں پر استوار ہو سکا ہے؟ کیا وہ ایک غیر زبان کے حاکمانہ تسلط سے آزاد ہو چکا ہے؟ کیا اس کی دوہری طبقاتی سطحیں ختم ہو کر یک آہنگی پیدا ہو چکی ہے؟

دوسرا یہ کہ اسلام کو غالب و کارفرما کرنے کا عمل، ۲۳ سال کی طویل مدت کے حساب سے کیا حوصلہ افزا حد تک ہو سکا ہے؟ اور جو مختصر سا بہت کام ہوا ہے، کیا اسے سیکولر ذہن کے بااثر طبقوں اور انحراف پسندوں کی دخل اندازیوں سے بچایا جا سکا ہے؟

تیسرا یہ کہ اردو زبان جسے مسلم تہذیب کی آئینہ دار قرار دے کر کانگریس نے تباہ کرنے کی کوشش شروع کی تھی اور جسے آج بھارت میں عملاً کچل دیا گیا ہے، کیا بہ حیثیت قومی زبان کے اس کے فروغ کے لیے ہم نے بھرپور اور قابلِ اطمینان کام کر لیا ہے؟

چوتھا یہ کہ کیا مسلمانوں کی زندگیوں کو سنوارنے کے لیے ہم نے ماحول کو منکرات و فواحش سے پاک کرنے کے لیے کوئی قابلِ فخر حصہ ادا کیا ہے؟

باتیں اور بھی بہت ہیں، مگر میں ان چار اصولی چیزوں کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہوں کہ اگر ان کے متعلق ہم اپنا احتساب کریں تو کیا ہمارے ضمیر تسلی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ۳۷ سال میں آزادی کا سفر بہت کامیابی اور تیز رفتاری سے طے کر لیا ہے۔

اُوپر کی گذارشات پر جب آپ سکون سے غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ آزادی کی فضا میں پہنچ کر بھی ابھی تک ہم ذہنی اور تہذیبی اور اخلاقی غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکے۔

؎ فلک پہ اُڑ کے بھی شاہیں اسیرِ دام رہے

اگر یہ احساس آپ کے اندر جاگ اُٹھے تو اللہ کا نام لے کر اب آزادی کی اُس راہ پر آگے بڑھیے، جس پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آپ نے پہلا قدم رکھا تھا۔

اعتذار

مجھے افسوس ہے کہ جون کے شمارے میں قصاص و دیت کی بحث کے سلسلے میں بعض حضرات کے حق میں ہمارا اندازِ بیان غیر محتاط ہو گیا۔ جن دوستوں کو کسی ریمارک سے تکلیف پہنچی ہو، اُن سے ہم معذرت چاہتے ہیں۔

(ادارہ)

توجّہ طلب

ایک بزرگ اور مخلص عالمِ دین نے تمام مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہا ہے کہ کتاب و سنّت اور اجماع سے طے شدہ مسائل کی مخالفت کسی شخص کو نہیں کرنی چاہیے اور خدا سے ڈرنا چاہیے، کیونکہ عنداللہ یہ شریعت کے خلاف گستاخی ہے۔

(ادارہ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

سیاست کا وسیع اسلامی تصوّر

(ادارہ)

آپ کے موجودہ سیاسی مسائل جن کی فکر میں آپ لوگ آج کل اُلجھے ہوئے ہیں، کس چیز کے پیدا کردہ ہیں؟ صرف اس چیز کے کہ جن اخلاقی اور اعتقادی و فکری اور تہذیبی و تمدنی بنیادوں پر اس ملک کی سوسائٹی قائم تھی وہ اتنی کمزور ثابت ہوئیں کہ ایک دوسری قوم اگرچہ وہ نہایت ہی گمراہ اور نہایت ہی غلط کار تھی، مگر بہرحال اپنے اخلاقی اوصاف، اپنی تہذیبی و تمدنی طاقت اور اپنی عملی قابلیتوں کے لحاظ سے وہ آپ سے اتنی زیادہ برتر ثابت ہوئی کہ ہزاروں میل دُور سے آکر اُس نے آپ کو اپنا محکوم بنا لیا۔ پھر آپ اپنی مدت ہائے دراز کی غفلتوں اور کمزوریوں کی وجہ سے اس حد تک گر گئے کہ خود اُس محکومی کے اندر بھی آپ کی ہمسایہ قومیں آپ کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوگئیں اور آپ کے لیے یہ سوال پیدا ہوگیا کہ اپنے آپ کو پہلے کس سے بچائیں۔ گھر والے سے یا باہر والے سے؟ یہ ہے آپ کے تمام موجودہ سیاسی مسائل کا خلاصہ، اور ان مسائل کو آپ بھی اور آپ کی ہمسایہ دوسری ہندوستانی (اب بھارتی و پاکستانی) قومیں بھی صرف اس طرح حل کرنا چاہتی ہیں کہ ملک کا سیاسی نظام جس شکل پر قائم ہے اُس میں کچھ اوپری رد و بدل ہو جائے۔

صرف ہندوستان (اب بھارت اور پاکستان) ہی میں نہیں بلکہ ساری دُنیا میں جو سیاسی مسائل اس وقت در پیش ہیں ان کا خلاصہ میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان کو جو حیثیت دُنیا میں فی الواقع حاصل نہیں تھی اسے خواہ مخواہ اپنی حیثیت بنا لینے پر اُس نے اصرار کیا اور

اپنے اخلاق، اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنی معیشت، اپنی سیاست کی بنیاد خدا سے خودمختاری پر رکھ دی جس کا انجام آج ایک عظیم الشان فساد اور ایک زبردست طوفانِ فسق و فجور کی شکل میں رونما ہو رہا ہے۔ اس انجام کو انتظامِ دنیا کی محض ظاہری شکلوں کے ردّ و بدل سے دُور کرنے کے لیے جو کوششیں آج کی جا رہی ہیں، انہی کا نام آج "سیاست" ہے، اور میرے نزدیک بلکہ فی الحقیقت اسلام کے نزدیک یہ ساری سیاست سراسر لغو ہے اور بے حاصل ہے۔ میں نے اسلام سے جن حقیقتوں کو سمجھا ہے، ان کی بنا پر میرے نزدیک ہندستان (اب بھارت اور پاکستان) کے مسلمانوں کی اور یہاں کے سارے باشندوں کی اور دنیائے مسلمین اور دنیائے غیر مسلمین کی سیاست کا حل صرف یہ ہے کہ ہم سب خدا کی بندگی اختیار کریں، اس کے قانون کو اپنا قانونِ حیات تسلیم کریں۔ اور انتظامِ دنیا کی زمامِ اختیار فساق و فجار کے بجائے عباد اللہ الصالحین کے ہاتھ میں ہو۔ یہ سیاست اگر آپ کو اپیل نہیں کرتی اور آپ کچھ دوسری سیاست بازیوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا راستہ الگ ہے اور میرا راستہ الگ۔ جائیے اور جن جن طریقوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں حل کر کے دیکھ لیجیے۔ مگر میں اور میرے رفقا علیٰ وجہ البصیرت جس چیز میں اپنی، اپنی قوم کی، اپنے ملک کی اور ساری دنیا کی فلاح دیکھتے ہیں، اسی پر ہم اپنی ساری کوششیں صرف کرتے رہیں گے۔ اگر دنیا کے لوگ ہماری باتوں کی طرف توجہ کریں گے تو ان کے اپنے لیے بھلا ہے اور نہ کریں گے تو اپنا کچھ بگاڑیں گے ہمارا کچھ نقصان نہ کریں گے۔

رہی یہ غلط فہمی کہ ہم زاہدوں اور گوشہ نشینوں کا ایک گروہ بنا رہے ہیں تو اگر یہ عمداً واقعہ کی غلط تعبیر نہیں ہے اور واقعی غلط فہمی ہی ہے تو اسے ہم صاف صاف رفع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو، اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیاداروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہونے کی بنا پر گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں

(باقی بر صفحہ ۵۶)

قرآن مجید میں تکرارِ واقعات کی حکمت وافادیت

میر محمد حسین - ایم اے - فاضل دیوبند

ولقد صرفنا فی ھٰذا القرآن للناس من کل مثل وکان الانسان اکثر شیٔ جدلاً - ۱۸/۵۴

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثال طرح طرح سے بیان کی ہے، اور انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے۔"

قرآن مجید میں بعض قصص و واقعات کا ذکر ایک سے زیادہ بار آیا ہے۔ عام مفسرین نے اس تکرار کی غرض محض تذکیر و یاددہانی بتائی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "بے شک قرآن مجید ایک دعوت اور عملی تحریک ہے جس کا فطری اقتضاء ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو، اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے بعد کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے، بلکہ اسی مرحلے کی باتوں کا اعادہ کیا جاتا رہے خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صرف ہو جائیں، اور پھر یہ اعادہ ایک ہی ڈھنگ اور ایک ہی عبارت میں نہ ہو کہ طبائع انہیں سن سن کر اکتا جائیں بلکہ ہر بار نئے الفاظ، نئے اسلوب اور نئی آن بان سے کہی جائیں۔"

تاہم جن حضرات نے قرآن مجید کے ان مقامات کا بغور مطالعہ کیا ہے انہوں نے محسوس کیا ہو گا کہ اگر کسی مقام پر اس واقعہ کے ایک پہلو کو نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے تو دوسرے

مقام پر اس کے کسی دوسرے پہلو کو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اعادہ کا مقصد محض عمومی قسم کی تذکیر و موعظت ہی نہیں، بلکہ سابقہ آیات کے سیاق و سباق میں واقعہ کے کسی خاص پہلو پر زور دینا مقصود ہے۔ جو اپنے ماسبق سے مربوط و وابستہ ہے۔

بار بار دہرائے جانے والے یہ واقعات و اشخاص مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قصۂ ابلیس و آدم

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش اور ان کے خوارقِ عادات

۴۔ حضرت موسیٰ، بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعات

۵۔ حضرات نوح، ہود، ابراہیم، لوط اور شعیب علیہم السلام اور ان کی اقوام کے واقعات۔

ان تمام مکرر واقعات کا بالتفصیل جائزہ لینا اس مختصر صحبت میں مشکل ہے، البتہ ان میں قصۂ ابلیس و آدم کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ہر مقام پہ ان کا ذکر کس پس منظر میں آیا ہے اور اس واقعہ کے کس پہلو پہ وہاں زور دینا مقصود ہے۔

قصۂ آدم و ابلیس

۱۔ یہ واقعہ سورۂ بقرہ کے شروع ہی ــــ رکوع ۴، ۵ ــــ میں مذکور ہوا ہے اور تقریباً دس آیات پر مشتمل ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ آغازِ سورہ میں قرآن مجید کے متعلق تین طرح کے لوگوں کے رویوں کا ذکر کیا گیا۔ اوّلاً اُن لوگوں کا جو اس کتاب لاریب پر ایمان لاتے اور اس کی تعلیمات کو ذہناً و عملاً اپنایا۔ ثانیاً اُن لوگوں کا جنھوں نے انکار و ہٹ دھرمی کی راہ اختیار کی۔ تاہم ان کا انکار کھلا، واشگاف اور واضح تھا۔ ثالثاً ان لوگوں کا جنھوں نے منافقت کی راہ اختیار کی۔ وہ اپنے آپ کو ظاہر تو اہلِ ایمان کرتے تھے مگر بباطن وہ کافر تھے اور کافروں کے ساتھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی صداقت اس کے اعجاز کے حوالے سے بصورت تحدی بیان کرتے ہوئے پوری نوعِ انسانی

سے مطالبہ کیا کہ وہ انکار و نفاق کی اس روش کو ترک کر کے اپنے خالق کی بندگی و اطاعت کی راہ اختیار کریں تاکہ وہ اس نیابت و خلافتِ الٰہیہ کا حق ادا کر سکیں جوان کے جدِ امجد آدم کے حوالے سے ان کے سپرد کی گئی تھی، اور اس فضیلت و برتری کا شکر ادا کر سکیں جو ملائکہ جیسی مقرب و نوری مخلوق کے مقابلہ میں ان کو دی گئی۔ اور اس شیطان کی طرح بغاوت و سرکشی کی راہ پر نہ چلیں جس نے آدم کو بہکا کر خدا کی نافرمانی پر اکسایا اور جنت سے نکلوایا اور اگر اب تک انھوں نے یہی راہ اختیار کر رکھی ہے تو اپنے باپ (آدم) کی طرح اپنی غلطی کا احساس کریں اور اپنی اصلاح کر کے انھی کی طرح خدا کے مقبول و محبوب ٹھیریں، نہ کہ شیطان کی طرح بغاوت و نافرمانی پر اصرار کر کے راندۂ بارگاہ قرار پائیں۔

اس واقعہ کے آخر میں ضمناً یہ بات بھی بتادی گئی کہ آدم کی اس غلطی اور شیطان کے اس بہکاوے سے انسان کی راہنمائی اور انتباہ کے لیے وحی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کا آغاز کرنے والا ہے۔

اس کے معاً بعد بنی اسرائیل کے کردارِ بد کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جس سے انھیں یہ بتانا مقصود ہے کہ تمھارا یہ طرزِ عمل اس منصبِ خلافت و امامت کے منافی، اپنے باپ کی راہ سے ہٹا ہوا اور شیطان کا سا ہے۔

۲ ـــــ سورۂ اعراف کے رکوع اول میں یہ واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ آیت نمبر ۸ تا آیت نمبر ۲۵ میں مذکور ہے۔ اس سے قبل کی آیات میں انسانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے جیسی مخلوق کی بجائے وحی الٰہی کا اتباع اختیار کریں ورنہ غلط نتائج اور خدا کی گرفت کے لیے تیار رہیں۔ اب قصہ آدم و ابلیس سنا کر انھیں یاد دلایا کہ شیطان انسانوں کو بدراہ کرنے کے لیے ہر طرح کے حیلے اور وساوس اختیار کرتا ہے اور اگر انسان وحی آسمانی کو چھوڑ کر اس کے اغوا میں آجائے تو انسانی زندگی کے شرمناک پہلو اور عیوب منظرِ عام پر آجاتے ہیں ـــــ شیطان کی پھیلائی ہوئی انھی گمراہیوں میں سے ایک لباس میں عریانی ہے اور اسی مناسبت سے اس واقعہ کے بعد متقیانہ لباس ـــــ جس میں زینت تو ہو مگر عریانی نہ ہو ـــــ کی تاکید کی اور پھر یہی با زینت لباس نماز کے لیے پہننے کو کہا۔

۳ — سورۂ حجر کا آغاز کفار کی اس آرزو سے ہو رہا ہے کہ کاش انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہوتا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی صداقت ان کے دلوں میں اتر چکی تھی مگر دنیوی لذائذ کی کشش یا اسلامی زندگی کے نظم سے گریز یا خود داعی کی ذات کا استخفاف ان کے آڑے آیا اور ایک دفعہ جب انکار کر چکے تو اب اسے نبھانے کے لیے کئی ایک الجھاوے پیدا کرتے چلے گئے۔ اسی تسلسل میں آدم و ابلیس کا قصہ سورہ کے دوسرے سے تیسرے رکوع تک مذکور ہوا جس میں ابلیس کی ایسی ہی ہٹ دھرمی کی مثال پیش کرنا مقصود معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور حکم کے باوجود ایک بار جب اس نے اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو پھر کرتا ہی چلا گیا اور اس کے لیے عذر تراشتا رہا تا آنکہ اسی ضد میں اپنی عاقبت تباہ کر لی۔

چونکہ سیاق و سباق سورہ میں اس حقیقت کا اظہار مقصود تھا کہ ضد میں آکر ایک دفعہ انکار اور پھر اس سے رجوع کی بجائے اسی پر اصرار ایک ابلیسانہ کردار ہے، اسی لیے اس سورہ میں آدم کے کردار کے بجائے ابلیس کے کردار کو زیادہ نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے۔ اس قصہ کے بعد ان اقوام کا مذکور رہے جنہوں نے ضد میں آکر انکار کیا اور اس پر ایسی جمیں کہ پھر تباہ ہو کر رہ گئیں۔

۴ — سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۱ سے ۶۵ تک میں شرک کی تردید و تغلیط کے بعد یہ واقعہ ذکر کر کے بتایا کہ اولاد و اموال میں کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانا بھی شیطان کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں میں سے ایک گمراہی ہے، اور ساتھ ہی اس حقارت کا بھی ذکر کیا جو شیطان کو انسان سے ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بہت سی مخلوق میں سے افضل و برتر بنایا ہے۔ اب یہ انسان کا اپنا قصور ہے کہ وہ اپنے محسن رب کی اطاعت و فرمانبرداری کی بجائے شیطان کا کہنا مان کر شرک کرتا ہے اور اپنے آپ کو اسی کی طرح خدا کے ہاں مغضوب و معتوب بنا لیتا ہے۔

۵ — پھر اسی سورت کی آیت ۵۰ میں اس واقعہ کو دہرانے سے پہلے بتایا کہ دنیوی زندگی اس فصل کی سی ہے جو چند روز لہلہا کر بھوسہ بن جاتی ہے، لہٰذا مال و اولاد کی ظاہری زینت

پر یہ کہ اس فانی زندگی (عارضی مہلتِ حیات) کو خدا کی نافرمانی و حکم عدولی میں صرف نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ابن آدم کا شیوہ نہیں، یہ تو شیطان کا وطیرہ ہے جس نے تمہارے باپ — آدم — کو ایسی ہی زندگی کا جھانسہ دے کر خدا کی حکم عدولی پر اُکسایا تھا۔

۶— سورہ طٰہٰ میں فرعون کی مجرمانہ روش اور پھر بنی اسرائیل کی احسان فراموشانہ و مشرکانہ سرگرمیوں کا حال بیان کرنے کے بعد آیات ۱۱۵ تا ۱۲۹ میں اس واقعہ کو ذکر کر کے بتایا کہ جس طرح آدم خدا کے حکم اور اس کے انتباہ کو بھول گیا اور اس کی ہدایت پر ثابت قدم نہ رہ سکا، اسی طرح اس کی اولاد بھی (یہاں بالخصوص بنی اسرائیل مراد ہیں) اس کی ہدایت کو بھول گئی، اپنے عہد پر قائم نہ رہی اور اس کی یاد سے غافل ہو کر دنیوی و اُخروی ناکامیوں سے دوچار ہوئی۔

۷— سورۂ صٓ کے آغاز میں بتایا تھا کہ قرآن تو ایک نصیحت اور یاددہانی کرانے والی کتاب ہے، لیکن کفار غرور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ان کے تکبر، نبی علیہ السلام پر ان کے اعتراضات کا ذکر ہے جن کی بنیاد ہی جذبۂ استحقار و استکبار پر ہے۔ اس پر پہلی اقوام کی ایسی ہی روش پر خدا کی گرفت کے حوالے سے تنبیہ کی گئی اور ساتھ ہی حضرات داود و سلیمان کا حال بتایا گیا کہ وہ کس طرح صاحبِ جبروت حکمران ہونے کے باوجود خدا سے انابت و استغفار کرتے رہتے تھے۔ اسی سلسلے میں حضرات ایوب، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل کا ذکر —— اپنے بہترین بندوں نہ کہ متکبرین کی حیثیت سے —— کیا۔ اور آخر میں بتایا کہ اسی تکبر و سرکشی نے ابلیس کو نافرمان اور انجام کار مردود اور جنت سے محروم بنایا۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ آدم و ابلیس کے قصے میں کہیں تو آدم کی خلافت اور اس کے تقاضوں کے پہلو پر زور دیا گیا ہے، اور کہیں معصیت کے بعد اظہارِ معذرت و استغفار کے پہلو پر۔ کسی جگہ اتباعِ وحی کی بجائے اتباعِ مخلوق کے نتائج پر متنبہ کیا گیا ہے تو کسی جگہ دل میں اعترافِ حق کے باوجود مادی اغراض و لذائذ کے لیے اس سے انکار و جحود پر۔ کہیں

(باقی بر صفحہ ۵۰)

فلپائن، بنکاک اور بنگلہ دیش

کا سفرنامہ

از مولانا خلیل حامدی - ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

جزائر فلپائن فلپائن کا دارالحکومت منیلا تو تین سال پیشتر دیکھ چکا ہوں - اب مورو مجاہدین کی طرف سے ایک عالمی اسلامی کانفرنس کا انعقاد کیا جا رہا ہے اُس میں شرکت کی بدولت فلپائن کے جنوبی علاقوں کو دیکھنے کا موقع مل رہا ہے - یہ علاقے تاریخ میں "مورو اسلامی مملکت" کہلاتے رہے ہیں - یہ علاقے متعدد جزائر پر مشتمل ہیں - مورو مملکت کا سب سے بڑا جزیرہ مینڈانائو (MINDANAO) ہے - دوسرا جزیرہ زمبوانگا (ZAMBOANGA) ہے چار اور قابلِ ذکر جزیرے ہیں: پاراون (PARAWAN) پاسیلان (PASILAN) سولو (SULU) اور تاوی تاوی (TAWI TAWI) - چھوٹے چھوٹے جزیرے بے شمار ہیں - ہوسکتا ہے کہ ان کی تعداد سو کے قریب ہو - ان جزائر (جو سرزمین مورو اسلامی کہلاتے ہیں) کے جنوب مشرق میں ملائشیا کی صباح سٹیٹ ہے - مغرب میں بحرالکاہل آرام فرما ہے - اور شمال میں دوسرے جزائر ہیں، جو فلپائن کا ہی ایک حصہ ہیں مثلاً جزیرہ لوزون (LUZON) اور جزیرہ بیسایا (VISAYA) - یہ دونوں جزیرے عیسائی اکثریت پر مشتمل ہیں - آخرالذکر جزیرے میں نیگرو نسل کے قبائل بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں، جو اب عیسائی ہوچکے ہیں - ہم اس وقت صرف جنوبی جزیروں کی بات کر رہے ہیں - جہاں مسلمانوں نے آزادی کی تحریک چلا رکھی ہے -

منیلا کی طرف

۱۶/اپریل ۱۹۸۴ء کو خاکسار شام ۵ بجے پی آئی اے سے منیلا روانہ ہوا۔ ۶ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز بنکاک اترا۔ پی آئی اے کو خاکسار نے ہمیشہ ترجیح دی ہے، لیکن اس مرتبہ پی آئی اے سے سخت نفرت ہوئی۔ جہاز والوں نے راستہ کا کھانا جس طرح بھوکے مار کر اور انتہائی مغفل کر کے دیا، وہ زندگی میں کبھی نہیں بھولے گا۔ بنکاک میں ۴۰ منٹ گزار کر منیلا روانہ ہو گئے۔ ۱۷/اپریل کی صبح کو منیلا ٹائم کے مطابق خاکسار ۹ بجے صبح (پاکستانی ٹائم کے مطابق ۶ بجے صبح) پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ پر چند نوجوان (جو خفیہ طور پر مورو محاذِ آزادی سے تعلق رکھتے ہیں) استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان میں سے ایک صاحب وہ ہیں جن کا لڑکا منصورہ میں سید مودودی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ میں زیرِ تعلیم ہے۔ انہوں نے فوراً اپنا تعارف کراتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا کہ "میرا بچہ سید مودودیؒ انسٹی ٹیوٹ کا طالب علم ہے۔"

منیلا ایئرپورٹ کا حسنِ انتظام

منیلا انٹرنیشنل ایئرپورٹ بڑا کشادہ اور خوبصورت ایئرپورٹ ہے۔ نظم و نسق کے لحاظ سے بھی اچھا ہے، صفائی کا بھی بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ویزا کے حصول کی کارروائی بھی لمحات میں طے پا گئی۔ ویزا آفیسر نے میرا پاسپورٹ لیا اور کسی سوال کے بغیر فوراً سٹیمپ لگا کر مجھے دے دیا۔ کسٹم کا نظام بھی ترقی یافتہ ہے۔ اگر مسافر کے پاس کسٹم ڈیوٹی ادا کرنے والا سامان ہے تو سرخ لائن کی طرف چلا جائے گا اور اگر ایسا کوئی سامان نہیں ہے تو گرین لائن کا رُخ کرے گا۔ اور کوئی شخص یہ تحقیق نہیں کرے گا کہ گرین لائن کی طرف جانے والا فی الواقع کسٹم ڈیوٹی ادا کرنے سے آزاد ہے۔ باشعور اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والی قوموں کے اندر یہ طریق نہایت مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

منیلا سے کوتاباتو

انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے نکل کر ہم لوگ داخلی ایئرپورٹ کی طرف آ گئے۔ دونوں میں کافی فاصلہ ہے، البتہ سواری سستی اور بافراط ہے، اس لیے مسافروں کو بالعموم دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ داخلی ایئرپورٹ بالکل ریلوے اسٹیشن معلوم ہوتا ہے۔ ہنگامہ آرائی، صفائی سے بے اعتنائی اور انتظار گاہ میں نشستوں کی قلت۔ اس ایئرپورٹ کی چند نمایاں علامات ہیں۔ اب میرا رخ جنوبی فلپائن میں جزیرہ مینڈاناؤ کے ایک شہر کوتاباتو (KOTABATO) کی طرف ہے۔ منیلا سے کوتاباتو سوا گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ پہلے اعلان میں کہا کہ جہاز دس بجے

(منیلا ٹائم کے مطابق) روانہ ہوگا، پھر تاخیر کا اعلان کیا گیا اور آخر کار بارہ بجے روانگی ہوئی۔ جو نوجوان مجھے چھوڑنے آئے تھے وہ اس وقت تک ایئر پورٹ پر ہی رہے جب تک میں جہاز میں سوار نہیں ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ فلائٹ سرے سے منسوخ نہ کر دی جائے۔ جنوبی فلپائن کے حالات میں تدوجزر پیدا ہوتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے انتظامات متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

فلپائن میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں لاتعداد جزیرے ہیں، بلکہ انڈونیشیا کی طرح یہ پورا ملک ہی جزیروں سے عبارت ہے، لیکن تین جزیرے ان میں سب سے بڑے ہیں۔ ایک شمالی جزیرہ لوزون (LOZON)۔ اس جزیرہ کی اکثریت عیسائی ہے۔ دوسرا وسطی جزیرہ بیسایا (VISAYA) ہے۔ بلکہ چند جزیروں کا جھمگٹا کہنا بہتر ہوگا۔ اس میں ایک حصہ نیگرو آبادی پر مشتمل ہے اس جزیرے کی اکثریت بھی عیسائی ہے اور تیسرا بڑا اور اہم جنوبی جزیرہ مینڈاناؤ ہے جسے مسلم جزیرہ کہا جاتا ہے۔ ان تمام جزائر کو باہم بحری مواصلات سے بھی ملا دیا گیا ہے اور ہوائی مواصلات سے بھی، بلکہ حیرت ہے کہ ان جزیروں کے اندر متعدد انٹرنیشنل ایئر پورٹ بھی ہیں۔ خود جزیرہ مینڈاناؤ میں چودہ ایئر پورٹ ہیں۔ ان میں دو ایئر پورٹ انٹرنیشنل ہیں۔ ایک کوٹا باتو ایئر پورٹ اور دوسرا داؤ (DAVAO) ایئر پورٹ۔ یہ کثیر التعداد ایئر پورٹ جہاں عوام کو سہولت فراہم کرتے ہیں، وہاں فوجی مقاصد بھی پورے کرتے ہیں۔

چنانچہ جب خاکسار منیلا کے داخلی ائر پورٹ پر بیٹھا اپنے جہاز کا انتظار کر رہا تھا تو ہر دس منٹ کے بعد ملک کے کسی نہ کسی حصے میں جہاز روانہ ہو رہا تھا۔ انتظار گاہ میں مسافروں کی اکثریت امریکی اور یورپی سیاحوں پر مشتمل تھا۔ ہر سیاح نے ایک ایک، دو دو فلپائنی لڑکیاں ساتھ لے رکھی تھیں، جنہیں وہ پورے ایام سیاحت میں رفیق سفر بنائے رکھیں گے۔ فلپائن ایک غریب ملک ہے اس لیے دولت مند سیاحوں کی چراگاہ بنا ہوا ہے۔ غربت کے ساتھ غیر مؤثر عیسائی مذہب بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس لیے لوگوں کے اخلاق و کردار اور ضمیر پر کسی بالاتر طاقت کا کنٹرول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلپائنی عیسائی لڑکیاں سیاحوں کے انتظار میں ماری ماری پھرتی رہتی ہیں[1] اس بات پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر

[1] آزادیٔ نسواں کی شاہراہ کی یہ اہم منزل ہے۔ (ف۔ ص)

بجا لاتے ہیں کہ فلپائن کی مسلم آبادی بڑی حد تک اس اباحت سے پاک ہے۔ اسے خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے کا کرشمہ کہہ سکتے ہیں، ورنہ مسلمان آبادی عیسائیوں سے زیادہ مفلوک الحال اور مظلوم ہے۔

انتظارگاہ میں مجھے پاکستانی لباس میں دیکھ کر ایک صاحب فوراً میری طرف لپکے۔ مجھے السلام علیکم کہا اور پھر فوراً کہنے لگے: "میں سیبو (SEBO) کا رہنے والا ہوں (یہ (VISAYAS) آئی لینڈ میں واقع ہے) وہاں میری کارپٹ کی فیکٹری ہے۔ میں مسلمان ہوں اور حج بھی کر چکا ہوں۔ اگر آپ کو سیبو آنے کا موقع ملے تو مجھے ضرور ملیے۔ میں اور میرے دوسرے مسلمان بھائی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" دور دراز جزیرے کے اندر بسنے والے ایک مسلمان کے یہ جذبات بڑے قابلِ قدر ہیں۔ اس نے مجھے صرف لباس اور چہرے سے پہچانا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور پھر برملا محبت و عقیدت کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ دراصل اسلام ایک عالمی مذہب ہی نہیں، بلکہ ایک عالمی سوز و گداز کا نام ہے۔ دل دلوں کو اور روح روحوں کو فوراً پہنچان لیتی ہے اور پھر رنگ و نسل اور زبان و زمین کے غیر معمولی تفاوت کے باوجود محبت و عقیدت کے پاکیزہ و پایدار رشتے جوش میں آجاتے ہیں۔ لَوْ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ مَا اَلَّفْتَ بَيْنَهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ۔ ارشادِ خداوندی ہے جس کی صداقت قدم قدم پر کرشمے دکھا رہی ہے۔

منیلا سے کوتا باتو ایک گھنٹے اور ۱۵ منٹ کا سفر ہے۔ ہم بوئنگ میں جا رہے ہیں۔ جہاز کے دریچوں سے جھانک کر دیکھیے تو نیچے عجیب منظر دکھائی دیتا ہے۔ ابھی ہم سمندر کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ اور اب ایک شاداب جزیرے کے اوپر آگئے ہیں۔ پھر سمندر اور پھر جزیرہ۔ سمندر بحرالکاہل کا ایک حصہ ہے اور حسبِ عادت خاموش و پرسکون۔ جزیرے ہرے بھرے کھیت اور پہاڑوں سے عبارت۔ عجیب و غریب دنیا۔ اگر اس کا خلاصہ نکالیں تو صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ: "دنیائے آب و گیاہ۔"

کوتا باتو ایئرپورٹ پر ہمارے معزز میزبان استاذ عمر باسیجان صاحب اور ابو خلیل یحییٰ صاحب اپنے کثیر نوجوانوں کے ساتھ استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تحریکِ اسلامی پاکستان کے ایک کارکن سے ان نوجوانوں کی قلبی محبت ان کے چہروں پر بے تحاشا برس رہی تھی۔ بعض

نے عربی زبان ہی میں خاکسار کا خیر مقدم کیا اور اکثر نے اپنی قومی زبان میں جھنڈا لہرائے ہیں۔ ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے جذباتِ اندروں کی شدید ہلچل کی غمازی کر رہے تھے۔ یہ نوجوان مورو ہیں۔ اور اسلام اور وطن سے ان کی محبت ان کی روحوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ایک طرف خواتین کی جماعت بھی کھڑی تھی۔ ابو خلیل یحییٰ نے بتایا کہ یہ مسلم خواتین بھی استقبال کے لیے آئی ہیں۔ انہیں بھی شوق ہوا کہ دُور سے آنے والے مہمان کا خیر مقدم کر کے اپنے اسلامی جذبہ کا اظہار کریں۔ یہ ہیں مورو مسلمان مرد اور خواتین۔

کوتا باتو شہر

کوتا باتو شہر کے اطراف کیا ہیں؟ بوستان و گلستان، ناریل کے دراز قد دل افروز درختوں کی قطاریں، کیلوں کے جھنڈ، آموں، شریفوں اور چیکو کے اشجارِ دلفگار کے باغات۔ گوناگوں پھولوں کے بوقلموں کلیوں کی عطر بیزی۔ یہ مناظرِ قدرت کے حسن و جمال کا ایک ایسا آئینہ ہے جسے دیکھ کر انسان خدا پر ایمان کی لذت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایئرپورٹ سے ہمارا پورا قافلہ کوتا باتو شہر کو چل پڑا۔ موسم گرم ہے، لیکن درختوں کے سائے اور زمین کی ٹھنڈک اور سبزے کی بہتات اس گرمی کو برابر چوستی جا رہی ہے۔ ابو خلیل یحییٰ صاحب نے مہمانوں کے لیے شہر کے ایک ہوٹل الکورازون میں ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ ہوٹل بالکل نیا ہے اور اس کا مالک ایک مسلمان ہے۔ راقم نے ابو خلیل سے کہا کہ آپ لوگ اس قدر تکلیف نہ اُٹھائیں ہم کسی معمولی جھونپڑی میں بھی گذارا کر سکتے ہوں۔ آپ لوگ افغانیوں کی طرح دَورِ جہاد سے گذر رہے ہیں، اس لیے مناسب یہ ہے کہ مالی وسائل کو جس قدر بچایا جا سکتا ہو بچایا جائے۔ ابو خلیل یحییٰ صاحب نے یہ کہہ کر راقم کی بات ٹال دی کہ دو ایک روز میں ہوٹل خالی کر کے کسی دوست کے گھر میں بسیرا کر لیا جائے گا۔ سردست ہوٹل میں آرام کریں۔

الکورازون ہوٹل میں

ابو خلیل یحییٰ اور ان کے جملہ رفقاء واپس چلے گئے۔ علی خنافی نامی ایک نوجوان کو ہوٹل میں میرے ساتھ چھوڑ گئے کہ یہ خدمت اور حفاظت دونوں کام سرانجام دے گا۔ خدمت کا مطلب تو سمجھ میں آجاتا ہے، لیکن حفاظت کا مطلب بعد میں سمجھ آیا۔ وہ یہ کہ اس شہر ہی کے نہیں، بلکہ اس پورے علاقے کے حالات معمول پر نہیں رہتے۔ سرکاری فوج اور مورو

محاذِ آزادی کے مجاہدین ہیں وقتاً فوقتاً جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں، اس لیے حکومت کی طرف سے ہر شخص کی نگرانی رکھی جاتی ہے۔ سرکاری کمانڈو تو دن رات اِدھر اُدھر سونگھتے رہتے ہیں اور جہاں کہیں انہیں کوئی "مشتبہ" آدمی نظر آئے اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میں گو غیر ملکی ہوں، مگر پھر بھی کسی مقامی انسان کا ہر وقت میرے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

الکورازدن ہوٹل بالکل نیا ہوٹل ہے۔ اس علاقے میں لکڑی بافراط پائی جاتی ہے۔ اس لیے تعمیر میں لکڑی فراخدلی سے استعمال کی گئی ہے۔ فرنیچر بھی لکڑی کا ہے اور مقامی سنتریوں کی قابلیت کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس فن میں مسلمان پیش پیش ہیں۔ الکورازدن ہوٹل جس روڈ پر واقع ہے وہ بڑی آباد ہے۔ میں جب کبھی ہوٹل کی بالکونی میں آکر بیٹھتا ہوں تو میری نگاہ دُور دُور تک مورولینڈ کا مشاہدہ کرتی رہتی ہے۔ شہر کے اکثر مکانات کھپربل کے بنے ہوئے ہیں یا چپر ٹین کی لمبی اور ترچھی چھتیں ہیں، البتہ چند عمارات بڑی پرشکوہ نظر آتی ہیں۔ یہ بنک ہیں یا کیتھولک یا پروٹسٹنٹ چرچ ہیں یا عیسائی مشنریوں کی یونیورسٹی ہے جسے (NOTRE DAME) یونیورسٹی کہا جاتا ہے، یہودی اور عیسائی تاجروں کے بڑے بڑے سٹور ہیں، سینما ہال اور گورنمنٹ دفاتر ہیں۔ چند ایک مسلمانوں کی عمارات بھی ہیں، مگر عیسائیوں کی عمارات کے مقابلے میں ہیچ۔ باقی پورا شہر ٹین یا پھوس کے پست مکانوں پر مشتمل نظر آتا ہے

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

راقم نے ہوٹل میں اُترتے ہی اپنے محافظ سے عرض کیا کہ ایک دن اور ایک رات کا تھکا ہوا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دو تین گھنٹے کی نیند کے بعد راقم جب اُٹھا تو علی غنانی متعدد زائرین سے آہستہ آہستہ محوِ گفتگو تھا۔ یہ لوگ خاکسار سے ملنے آئے ہیں، مگر علی غنانی نے انہیں روک رکھا ہے۔ علی غنانی نے بتایا کہ یہ لوگ میرے لیٹ جانے کے فوراً بعد ہی آگئے تھے، مگر ملاقات کے لیے بیٹھ گئے۔ کسی دُور مقام سے آئے ہیں، اس لیے واپس جانے سے پہلے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک صاحب کا لڑکا منصورہ میں سید مودودی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھتا ہے۔ وہ اظہارِ تشکر کے لیے آئے ہیں۔

دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھایا۔ یہاں کی بنیادی خوراک چاول اور مچھلی ہے۔ روٹی کے تصور سے لوگ ناآشنا ہیں۔ ڈبل روٹی کا قدرے رواج ہے۔ سیاحوں کی آمد کی وجہ سے ہوٹل میں یورپی طرز کے کھانے کا اہتمام کر لیا جاتا ہے۔ راقم ان تکلفات سے بری ہے جو میسر آیا، کھالیا۔

کوتاباتو کی معاشرتی زندگی

پچھلے ٹائم راقم اور علی غنافی شہر کی سیر کو نکل گئے۔ اس شہر کی آبادی علی غناقی کے کہنے کے مطابق زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ ہوگی۔ یہ مینڈاناؤ جزیرے کا سب سے بڑا شہر ہے۔ پورے جزیرے کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ کوتاباتو شہر کی سڑکیں کشادہ ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک وسیع پارک ہے جس میں ایک طرف عیسائیوں نے حضرت مسیح اور مریم علیہما السلام کے مجسّمے عنبِ عادت نصب کر رکھے ہیں اور دوسری طرف مورو مسلمانوں کے ایک قومی ہیرو کا مجسمہ ہے جس کا نام حسین ارسلان ہے۔ یہ شخص ڈاکٹر آف میڈیسن تھا اور اس نے اپنی قوم کی بڑی خدمت کی ہے۔

پارک کے اندر جگہ جگہ سیمنٹ کے بنچ رکھے ہوئے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گروہ در گروہ اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پارک کے فٹ پاتھوں پر بوڑھی عورتیں اور نوجوان بچیاں بھی چھابڑیوں میں سامان رکھ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان چھابڑیوں میں فروٹ، انڈے، بسکٹ، دیاسلائیاں اور اسی نوعیت کی اور چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ بیچنے والے بھی فقیر اور اُن کے خریدار بھی فقیر۔ مردوں کا لباس پتلون اور قمیص اور عورتیں اسکرٹ پہنے ہوئے۔ کچھ عورتوں نے اسکرٹ کے اُوپر لنگی باندھ رکھی ہے۔ سر سب کے ننگے۔ ان چھابڑی فروشوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ پارک میں بیٹھنے والے گروہ اکثر بے روزگاری کے ستائے ہوئے یہاں آکر وقت گزارتے ہیں اور کچھ سیر و تفریح کرنے والے منچلے بھی ہیں۔

سبزی مارکیٹ کے پاس سے گذرے۔ پورا بازار پھلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ناریل، انناس، تربوز، آم، چیکو، کیلا، شریفہ ڈھیروں پڑا ہے اور بیچنے والی سب عورتیں سن رسیدہ بھی اور نوجوان بھی۔ اور سب مسلمان۔ مرغی، انڈے، کباب، مچھلی تلی ہوئی، سموسوں سے ملتی جلتی سی اشیاء، اسی طرح چاول، چینی، ایندھن اور سبزی یہ سب اس بازار میں ملتی ہیں اور یہ پوری

سروس عورتیں اور لڑکیاں انجام دیتی ہیں ۔ بازار میں صفائی نہیں ہے ۔ کم مایہ دکانداروں کا جو حال ہوتا ہے یہ مارکیٹ اس کی صحیح تصویر پیش کر رہی ہے ۔ چاول کی قیمت ایک کلو ۳ پیسو سے لے کر ۱/۲ ۴ پیسو تک (فلپائنی پیسو پاکستانی روپے کے برابر ہے) چیکو ۵ پیسو کلو، کیلا ۵ پیسو کا ایک گچھا (جس میں دو درجن سے زیادہ ہی کیلے ہوتے ہیں) ۔ سوختنی لکڑی کا ایک گٹھا ایک پیسو (جس کا وزن تین کلو سے زیادہ ہوگا) میں فروخت ہوتا ہے ۔ زندہ مرغی ۲۵ پیسو میں بکتی ہے ۔ اور اُبلا ہوا انڈہ دو پیسو میں ۔ علی غنانی نے بتایا : ہم لوگ سخت گرانی محسوس کر رہے ہیں ۔ بیروزگاری عام ہے ۔ کاروبارِ زندگی محدود ہے ۔ اچھے سے اچھا روزگار ۱۵ پیسو یومیہ سے زیادہ نہیں ہے اگر آمدنی کا یہ حال ہو تو پھر گھٹیا چاول جو عام خوراک ہے ۳ پیسو کو بھی بہت بوجھ محسوس ہوتا ہے ۔ سستی چیز یہاں کی مچھلی ہے ۔ جسے کچھ دستیاب نہ ہو وہ مچھلی پکڑ کر پکا لیتا ہے یا کچا کیلا اُبال کر شکم پُری کر لیتا ہے ۔

عیسائیوں کے اثرات کوتاباتو مسلمانوں کا تاریخی شہر ہے ۔ یہاں مسلم سلاطین کا اقتدار رہا ہے ۔ اب اس شہر میں گرجوں کی تعداد زیادہ اور مسجدوں کی تعداد بہت کم ہے ۔ پورے شہر میں شاید دس سے زیادہ مسجدیں نہ ہوں گی جب کہ گرجا قدم قدم پر ملے گا ۔ عیسائیوں کے دونوں فرقے یہاں سرگرمِ عمل ہیں، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ۔ گرجوں کے علاوہ ان کی کئی عمارات ہیں NOTRE DAME یونیورسٹی کا پیچھے تذکرہ گزر چکا ہے ۔ اور بھی ان کے کئی کالج اور تعلیمی و فنی ادارے اور اسپتال ہیں ۔ کوتاباتو کا سب سے عظیم الشان اسپتال عیسائی مشنری کا ہے ۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں ان کے ہاتھ میں ہیں، بڑے بڑے سرکاری مناصب پر یہ براجمان ہیں، جاگیروں اور میوں باغات کے مالک یہ ہیں ۔ اس علاقے میں گو یہ اقلیت میں ہیں اور یہ زیادہ تر لوزون جزیرے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور فلپائن کا دارالحکومت منیلا ان کا مرکز ہے، مگر جزیرہ مینڈاناؤ اور دیگر مسلم جزائر پر ان کا معاشی و ثقافتی اور سیاسی غلبہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کوتاباتو گو مسلم شہر ہے، مگر یہاں عریانی کا رواج ہے، شراب خانے کھلے ہوئے ہیں اور مخلوط معاشرت کے خوفناک مناظر ملتے ہیں ۔

کوتاباتو کی مسلمان آبادی اپنے ہی شہر اور اپنے ہی تاریخی وطن میں اکثریت کے باوجود تہی دست

اور خستہ حال ہے۔ چھوٹی سطح کی دکانداری، اٹھائی گیری، پھیری، ماہی گیری اور معمولی دستکاری پر ان کا معاشی دارومدار ہے۔ میں نے علی خناقی سے پوچھا کہ کیا مسلمان گھرانے یہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی سن رسیدہ مائیں اور نوخیز دوشیزائیں بازار میں کھوکھے کھولیں اور چھابڑی لگائیں؟ علی نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے پاس یہی کام ذریعہ معاش ہیں۔ اگر اتنا بھی نہ کریں تو کہاں سے کھائیں۔ ان کے مرد بھی کماتے ہیں اور عورتیں بھی، تب جا کر گزر بسر ہوتی ہے۔ اچھے حالات میں کوئی شخص یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے بچے اور بچیاں تعلیم و تربیت کے بجائے بازار میں بیٹھ کر چند پیسو کمانے کی فکر میں رہیں۔

۱۸/ اپریل ۱۹۸۴ء کو صبح ناشتے میں بھی چاول اُبلے ہوئے انڈوں کے ساتھ کھائے۔ چائے کی جگہ بیرہ کافی دے گیا۔ اسی ہلکے پھلکے ناشتے پر گزارا کرلیا۔

ایک مورو نوجوان علی خناقی میرا رفیقِ ہوٹل بڑا باشعور نوجوان ہے۔ اس نے مجھ سے "بنگسا مورو" (انگریزی کی کتاب جسے ہم نے ادارۂ معارفِ اسلامی کی طرف سے چھاپا ہے) لے لی اور راتوں رات کافی پڑھ ڈالی۔ اس کتاب میں جنوبی فلپائن یعنی مورولینڈ کی تاریخ اور ان کے سلاطین کی داستانیں اور ان کی جنگی کارروائیاں بیان کی گئی ہیں۔ علی نے شاید پہلی مرتبہ ایک ایسی کتاب دیکھی ہے جو اس کی اپنی تاریخ اور اپنی تصویرِ حیات پیش کر رہی ہے۔ اسے شوق ہے کہ مجھے اپنے ملک کے حالات سنائے۔ ایک نوجوان ہونے کی حیثیت سے اس کے جذبات اُبلتے ہیں اور پھر گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اسے اس بات پر بہت دکھ ہے کہ کوتاباتو کے تمام جدید تعلیم کے ادارے عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس شہر میں عیسائیوں کی دو یونیورسٹیاں ہیں ان کے اساتذہ عیسائی ہیں اور طلبا نوّے فی صد مسلمان۔ تعلیم تو سیکولر ہے، مگر عیسائیت کی تبلیغ زور و شور سے کی جاتی ہے۔

ایک مورو عالمِ دین ناشتے سے فارغ ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ مجندا ناؤ - MAGUIN - DANAO - کا ایک وفد علی اسماعیل صاحب کی قیادت میں خاکسار سے ملنے کے لیے آیا۔ مجندا ناؤ کوتو باتو سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک تاریخی مقام ہے۔ علی اسماعیل نہایت فصیح عربی بولتے ہیں۔ انہوں نے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ مجھے بتانے لگے کہ میں نے مدینہ یونیورسٹی میں

مولانا مودودیؒ کو دیکھا تھا اور ان کی تقریر بھی سنی تھی۔ اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے کہنے لگا کہ مولانا مودودیؒ اس دور کے عظیم اسلامی مفکر گزرے ہیں۔ ان کی کتابیں صحیح معنوں میں اسلام کا راستہ واضح کرتی ہیں۔ علی اسماعیل کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ بھی عربی بول لیتے ہیں۔ راشد مامو اور شہاب الدین دونوں عربی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ صرف طیب طاہر نامی ایک ساتھی عربی سے ناواقف ہے۔ علی اسماعیل نے بتایا کہ مجنداناؤ میں "مجنداناؤ مسلم ایسوسی ایشن" کی طرف سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا گیا ہے جس کا نام ہے المعہد الرحمانی العربی الاسلامی۔ وہ (علی اسماعیل) اس معہد کے ڈائرکٹر ہیں۔ راشد مامو اس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں اور دیگر رفیق اس کے ٹیچروں میں شامل ہیں۔ اس معہد میں ۸۰۰ لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں۔ مختلف شہروں اور جزیروں میں اس کی ۱۸ شاخیں ہیں جن میں تعلیم پانے والے لڑکے اور لڑکیوں کی مجموعی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ یہ معہد ثانوی درجے کا ہے یہاں سے فارغ ہونے والے کو مدینہ یونیورسٹی میں داخل کر لیا جاتا ہے۔

مورو کی تعلیمی پس ماندگی

علی اسماعیل اچھا باشعور، صاحبِ علم اور فعال آدمی نظر آتا ہے۔ تعلیمی امور پر بحث کرتے ہوئے کہنے لگا کہ جنوبی فلپائن کا مسلمان تعلیم میں بہت پسماندہ ہے، خصوصاً جدید تعلیم اور ٹیکنالوجی سے بڑی حد تک بے بہرہ ہے۔ اب مسلمان اپنی کوششوں سے کچھ جدید تعلیمی ادارے قائم کر رہے ہیں، مگر وہ بھی ثانوی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ پائے۔ سرکاری جامعات اور مسیحی جامعات میں اگر ہم اپنے نوجوانوں کو مجبوراً تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں تو ان کا دین اور اخلاق دونوں خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ علی اسماعیل جب یہ بات کر رہا تھا تو اس کے چہرے پر غم کے آثار بھی ابھر آئے اور غصے کے بھی۔

داستانِ جہاد

اب علی اسماعیل نے تعلیم کا موضوع چھوڑ کر جہاد کا موضوع چھیڑ دیا۔ یہ موضوع پہلے موضوع سے بھی زیادہ حساس ہے، لیکن آپ جس مورو مسلمان سے ملیں خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا مزدور وہ جہاد کی کہانی بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ موضوع چھیڑ کر وہ اپنے دل کے تار بھی ہلا دیتا ہے۔ اور سامع کے دل کے تار بھی زیرِ مضراب آجاتے ہیں۔ مورو جہاد کی داستان تو بہت لمبی ہے اور قدیم بھی، مگر اس سلسلے کی آخری داستان نے مورو مسلمانوں کے اندر گہرے زخم لگائے ہیں۔ ابھی تک ان سے ٹیس اٹھ رہی ہے۔ یہ داستان ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۶ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ عرصہ گو صرف ۶ سال کو محیط ہے، مگر اس کے نقوش و آثار انمٹ اور اس کے نتائج و عواقب لامتناہی ہیں۔

جہاد اور اس کے نتائج یہ موقع اس داستان کی تفصیل و تجزیہ کا نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں مورو مسلمانوں نے "مورو محاذِ آزادی" کے تحت مارکوس کی صلیب پرست اور غاصب حکومت کے خلاف جنگِ آزادی شروع کی۔ اس جنگ کی قیادت صرف مورو محاذِ آزادی تنظیم کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمان عوام نے اس جنگ میں محاذِ آزادی کا پورا پورا ساتھ دیا۔ باہر سے بھی بعض ممالک کی جانب سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ آخر کار مارکوس گفت و شنید پر آمادہ ہوا۔ طرابلس (لیبیا) میں قذافی کی وساطت سے مورو محاذ کے لیڈروں نے جن کی قیادت محاذ کا صدر نور مسواری کر رہا تھا۔ اور مارکوس کے نمائندوں (جن کی قیادت مارکوس کی بیوی "حسینہ فلپائن" کر رہی تھی) کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ "طرابلس ایگریمنٹ" کے عنوان سے معروف ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے مارکوس نے یہ وعدہ کیا کہ اگر مورو محاذ جنگ بندی کا اعلان کر دے تو وہ جنوبی فلپائن کو علاقائی خودمختاری (ریجنل اٹانومی) دے گا۔ اس معاہدے میں نور مسواری نے کمزوری دکھائی (تیز خیال ہے کہ آج تک مارکوس نے اس معاہدے پر عمل درآمد نہیں کیا)۔ علی اسماعیل کے بیان کے مطابق نور مسواری نے تحریک جہاد کے ساتھ خیانت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محاذ کے تمام نمایاں کمانڈر نور مسواری کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے لکھ کر دے دیا کہ وہ نور مسواری کو اپنا نمائندہ نہیں سمجھتے۔ سلامت ہاشم محاذ کے نائب صدر تھے۔ تمام کمانڈروں نے انہیں اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ مورو علماء نے بھی ایک متفقہ فتویٰ صادر کر دیا جس میں نور مسواری کے بجائے سلامت ہاشم کو قائد تسلیم کر لیا گیا۔ اس وقت سے تمام مورو مسلمان سلامت ہاشم کے ساتھ ہیں۔ ان تمام جزائر میں سلامت ہاشم کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ اہلِ دین و اہلِ دعوت اور اسلام سے محبت رکھنے والا کوئی شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو سلامت ہاشم کا ساتھ نہ دیتا ہو۔ نور مسواری اپنی مقبولیت کھو چکا ہے۔ جزیرہ سولو (SULU) اور جزیرہ تاوی تاوی (TAWI TAWI) کے کچھ لوگ نور مسواری کے ساتھ ہوں گے۔ کیونکہ نور مسواری اسی جزیرے کا رہنے والا ہے۔ نیز کچھ بائیں بازو کے عناصر اور اشتراکیت نواز نوجوان نور مسواری کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت مرد، عورتیں اور بچے تک سلامت ہاشم کے حامی ہیں۔

(باقی)

خاص برائے ماہنامہ ترجمان القرآن

پرنس لیونے کائتانی دی سرمونیتا[1]

پروفیسر ڈاکٹر محمود بریلوی - کراچی

شہر روم (اطالیہ) کے مضافات میں آج بھی ایک شاندار چار منزلہ قدیم محل کھڑا ہے جو پندرھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا اور کائتانی نام کے خاندان کی ملکیت ہے۔ اسی محل میں پرنس لیونے کائتانی دی سرمونیتا (ڈیوک آف سرمونیتا) ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوا تھا، جس نے بعد ازاں اپنی شہرہ آفاق تصنیف (ANNALI DELL ISLAM) (تاریخ اسلام) اطالوی زبان میں لکھی جو شہر میلان (MILAN) سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ قدیم کائتانی خاندان اطالیہ میں بہت با اثر تھا جس میں دو پوپ (گیلاسیاس GELASIKS ۱۱۱۸ء اور بونی فاس BONIFACE ہشتم ۱۲۹۱ء) اور متعدد کارڈینل CARDINAL ہوئے تھے۔ اس خاندان کے ایک رکن کانراڈ کائتانی CONRAD CAETANI نے شہنشاہ فریڈرک دوئم کی بیٹی کانسٹینس (CONSTONCE) سے شادی کی تھی۔ پرنس لیونے کائتانی روم میں ۱۲ ستمبر ۱۸۶۹ء کو ایک انگریز ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ وہ بچپن ہی میں تین زبانیں (اطالوی، انگریزی اور جرمن) بولنے پر قادر تھا۔ اس کا باپ ڈون اونوراٹو کائتانی (DON ONORATO CAETONI)

[1] PRINCE LEONE CAETANI DI SERMONETE ۱۹۳۵ء-۱۸۶۹ء

اوائل انیسویں صدی عیسوی میں اطالوی وزیر خارجہ تھا۔ لیونے کائتانی نے روم ہی میں ۱۸۸۹ء میں بیروت کے ایک نصرانی نقاش سے عربی زبان و ادب سیکھ لیے تھے اور ۱۸۹۱ء میں روم کی یونیورسٹی سے لٹریچر میں گریجولیشن کیا تھا۔ مذکورہ بالا زبانوں کے علاوہ کائتانی فارسی، سنسکرت اور عبرانی زبانیں بھی جانتا تھا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں کائتانی نے تاریخِ اسلام مرتب کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ وہ ۱۸۸۸ء میں یونان گیا، جہاں سے وہ مصر پہنچا اور جزیرہ نمائے سینائی کے پہاڑوں اور ریگستان میں قدیم تاریخی یادگاروں کا مشاہدہ کیا۔ ۱۸۹۲ء میں وہ الجیریا اور ٹیونس گیا جہاں سے اُس نے صحرائے اعظم کے ویرانے دیکھے۔ ان مشاہدات کو کائیتانی نے شارٹ ہینڈ میں سات جلدوں میں مدوّن کر لیا تھا، مگر وہ سب شائع نہ ہو سکیں۔ ۱۸۹۴ء میں کائتانی ایک طویل سفر پر روانہ ہوا جس کے دوران اُس نے مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا دورہ کیا۔ وہ مصر، شام، فلسطین، ترکی، عراق اور ایران گیا۔ اور پھر وسطی ایشیا اور روس پہنچا۔ ۱۸۹۹ء میں وہ شکار کے سلسلے میں کولمبو (سری لنکا) گیا جہاں سے وہ جنوبی ہند کے علاقوں مدورا، ترچنا پولی، حیدر آباد (دکن) اور مدراس پہنچا۔ کلکتہ میں وہ وائسرائے ہند لارڈ کرزن کا مہمان رہا اور بنگال اور بہار کے جنگلوں میں اس نے شیر کا شکار کیا۔ وہاں سے کائتانی نے بنارس، آگرہ اور دہلی کا سفر کیا اور موسمِ گرما کے آغاز میں واپس اطالیہ چلا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ آخری بار مصر گیا تھا۔

کائتانی رومن کیتھولک نصرانی عقاید و رسوم سے متنفر تھا اور انہیں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے بغاوت باور کرتا تھا۔ وہ نصرانیت کے مقابلے میں قدیم یونانی اور رومی عقاید کو بہتر سمجھتا تھا۔ وہ رومن کیتھولک مذہب اور اس کی رسوم کو سوشلزم، آزادی اور ڈیماکریسی کی ترویج میں بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ وہ اُس دن کے طلوع ہونے کا منتظر تھا جب نصرانیت کا خاتمہ اور انسانی آزادی کا آغاز ہوگا۔ لیکن یہ امر حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم ہے کہ نصرانیت کے خلاف اس بغاوت کے باوجود کائتانی عیسائی مبلّغین کا دوست تھا۔

جب پرنس کائیتانی نے اپنی تاریخ اسلام (ANNALI DELL ISLAM) کی پہلی جلد ۱۹۰۵ء میں شائع کی تو مغربی مستشرقین کی دنیا میں ایک غلغلہ بپا ہوگیا، کیونکہ اُس وقت تک کسی غیر اسلامی ملک یا زبان میں ایسی عظیم الشان علمی تحقیقی و ہمدردانہ کاوش منصّۂ شہود پہ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس عظیم علمی کارنامے کو دنیا کے سامنے لانے سے قبل کائیتانی نے پندرہ سال کی طویل مدت تحقیق و تفتیش اور غور و خوض میں صرف کی تھی۔ وہ آغازِ اسلام سے لے کر ۱۵۱۷ء میں ترکوں کے ہاتھ سے مصر کی فتح تک عرب قوم کی تاریخ مرتب کرنا چاہتا تھا جس کے لیے ضروری مواد فراہم کرنے کی خاطر اس نے اپنی دولت بے دریغ صرف کی تھی۔ اُس نے لندن، آکسفورڈ، پیرس، برلن، لینن گراڈ، ویانا، استنبول اور قاہرہ کے کتب خانوں سے نایاب اسلامی مسودات و مخطوطات کے فوٹو لینے پر ہی پانچ لاکھ لیرا (ایک لاکھ پونڈ) کی خطیر رقم خرچ کی تھی۔ چنانچہ روم میں کائیتانی کی نجی لائبریری دنیا بھر میں سب سے زیادہ اہم اسلامی علمی خزانہ تسلیم کی جاتی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ (۱۹۱۸ء) تک کائتانی کی تاریخِ اسلام کی صرف سات ابتدائی جلدیں شائع ہوئی تھیں جن میں ۳۲ھ تک کے حالات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ مسلسل اکیس سال تک کائتانی بے شمار رکاوٹوں اور موانعات کے باوجود اس نہایت اہم علمی و تحقیقی کاوش میں منہمک رہا، جس کے آخر میں (۱۹۲۶ء) اُس نے اپنی اطالوی تاریخِ اسلام کی دسویں جلد شائع کی جو چالیس ہجری تک کے حالات پر مبنی تھی۔ افسوس کہ اس کے بعد ملک اطالیہ کے سیاسی حالات بہت بگڑ گئے اور کائتانی کو اپنی تاریخ اسلام کو نامکمل چھوڑ کے ۱۹۳۰ء میں جلاوطنی اختیار کرنا پڑی اور وہ کینیڈا میں جابسا۔

ANNALI DELL ISLAM (تاریخِ اسلام) کی اطالوی زبان میں پہلی جلد تو کائتانی نے خود بلا کسی کی مدد کے شائع کی، مگر اُس کو دیکھ کر دنیا کے معروف نصرانی اور یہودی مستشرقین نے کائتانی کو اپنی امداد کی پیش کش کی، جن میں حسب ذیل ہستیاں شامل تھیں۔

۱۔ پروفیسر ہارووِٹز HOROWITZ (جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی زبان کے معلم رہے)، ۲۔ پروفیسر بیکر (BECKER) ۳۔ فادر لیمنز (LAMMENS)

۴- پروفیسر میٹ واخ (MITTWOCH)، پروفیسر سی گبرائیلی (GABRIELI)
۶- پروفیسر نلینو (NALLINO)، ۷ پروفیسر مائیکل انجیلو گائیڈی MICHEL-ANGELO GUIDI) اور ۸- پروفیسر جارجیو لیوی دیلا وِدا (G. LEVI DELL VIDA) وغیرہ۔

اپنی اس اطالوی تاریخ اسلام کی دس جلدوں کے علاوہ، جس کی ہر جلد کی ضخامت (انڈکس کی جلد کے علاوہ) سات سو بڑے سائز فولیو کے صفحات سے زائد تھی۔ کائیتانی نے اسلامی موضوعات پر متعدد دیگر اہم اسلامی تصانیف مرتب کیں۔ ANNALI کے ساتھ ساتھ ہی اس نے CRONOGRAPHIA ISLAMICA (اطالوی) بھی شائع کرنا شروع کر دی تھی جس میں دنیائے اسلام کے جملہ اہم تاریخی واقعات ترتیب وار پہلی صدی ہجری سے لے کر ۹۲۲ھ تک درج کرنا مقصود تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ اہم کام بھی تاریخ اسلام کی طرح نامکمل رہا جس کی صرف دو ابتدائی جلدیں شائع ہو سکیں، جن میں محض ۱۴۷ھ ہجری (۷۶۳ء) تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

ANNALI کے بعد کائتانی کی اہم ترین اسلامی تخلیق ONOMASTICUM ARABIUM ہے جو تاریخِ اسلام میں ذکر ہونے والے تمام مخصوص مقامات اور اشخاص کے اجمالی حوالوں پر مبنی ہے، لیکن افسوس کہ یہ نامکمل تصنیف بھی محض ۲ جلدوں اور لفظ "عبداللہ" تک محدود رہی۔

ان کے علاوہ کائتانی نے چار جلدوں میں اپنی STUDI DI STORIA ORIENTALE بھی مرتب کرنا شروع کی تھی، لیکن اس کی بھی محض دو جلدیں ہی شائع ہو سکیں۔ پہلی ۱۹۱۱ء میں اور تیسری ۱۹۱۴ء میں۔ اِن میں کائتانی نے اپنی تاریخِ اسلام ہی کے مخصوص و چیدہ چیدہ کوائف کو ایک مختلف انداز سے دہرایا تھا۔ یعنی اپنی اِس تصنیف میں اُس نے طلوعِ اسلام کا جدید جغرافیائی و اقتصادی نظریات کی روشنی میں جائزہ لیا تھا۔ کائتانی کی ایک اور نہایت دلچسپ لیکن نامکمل اطالوی تخلیقِ علمی FUNZIONE DELL ISLAMNELL EVOLU-ZIONE DELLA CIVILITA (تہذیب و تمدن انسانی کی ترقی میں اسلام کا حصہ)

اس میں اس نے مغربی تہذیب کے حوالے سے اسلام کے صحیح مقام کا تعین کیا ہے۔

مغربی دنیا کے تقریباً تمام غیر مسلم (یہودی اور نصرانی) مستشرقین مثلاً اسپرینگر (SPRENGER)، مُلر (MULLER)، ہرگرونجے (HURGRONJE)، میور (MUIR)، گریم (GRIMME)، لیمنز (LAMMENS) اور مارگو لیتھ (MARGOLIOUTH) وغیرہ نے اسلام و شارع اسلامؐ کو تعصبِ مذہبی کے ساتھ پیش کیا ہے اور اُن پر تنقید نہیں بلکہ عمداً تنقیص کی ہے۔ اس مخالفِ اسلام گروہ کے بالمقابل پرنس کائتانی حیرت انگیز طور پر ایک مختلف و ممتاز شخصیت تھا جس نے خود کو ان سے غیر متعلق رکھا۔ وہ رومن کیتھولک عقیدۂ نصرانیت کا شدید مخالف تھا۔ بلکہ اس کو مخالفِ عیسائیت کہنا زیادہ قرینِ صحت ہوگا۔ وہ دراصل ڈیماکریسی اور سوشلزم کا شیدائی تھا جو نصرانیت کی ضد ہیں۔ بہ ایں ہمہ کائتانی پیغمبر اسلامؐ کی ذاتِ اقدس اور اس کی تحریک اسلام کو اُس زاویہ سے نہیں دیکھتا جو اسلام کی روح ہیں۔ وہ اسلام اور شارع اسلام کو اُنیسویں صدی عیسوی کی مادیت کے رنگین شیشوں کے ذریعے سے دیکھتا ہے۔ اور پیغمبر اسلام کی اس روحانی صفت کو نظر انداز کر دیتا ہے جو آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ پیغمبر اور نبی کے طور پر ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ وہ رسول اللہ کو اُنیسویں صدی کے ایک زیرک و محبِ وطن مدبّر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو ڈپلومیسی کے فن میں طاق تھے اور جو صرف اپنی قوم (عرب) کی اصلاح کے جویا تھے، نہ کہ تمام انسانیت کے (نعوذ باللہ)۔ یہ نظریہ یقیناً و حقیقتاً صحیح عقیدۂ اسلام کی قطعی نفی کرتا ہے، کیونکہ رسول اللہ کو محض ایک مدبّر و سیاست دان ظاہر کرنا اُن کی سخت توہین ہے اور حضورؐ اور ان کی تحریکِ اسلامی کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے، کیونکہ حضورؐ نے ہرگز اخلاق کو زندگی کی مادی اقدار سے جُدا نہیں کیا۔ اس فروگذاشت کے باوجود کائتانی نے اکثر غیر مسلم مستشرقین کے اُن معاندانہ و احمقانہ الزامات کی شدید تردید کی ہے جو اُن اسلام دشمن یہودی و نصرانی اہلِ قلم نے اسلام و شارع اسلامؐ پر لگائے ہیں۔ کائتانی رسول اللہ کا بڑا مداح تھا اور اس نے ان کی غیر معمولی صفاتِ انسانی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے رسول کریمؐ کو "تاریخِ عالم کی عظیم و مشہور ترین ہستی" تسلیم کیا ہے۔

کائتانی اپنی قومی و بین الاقوامی سیاست میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ وہ بڑا متحرک اور پکا سوشلسٹ تھا اور اس حیثیت سے وہ چار سال تک (۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء) اطالوی مجلسِ مقننہ (چیمبر آف ڈیپوٹیز) کا رکن رہا تھا۔ اس کے سیاسی مخالفین نے پہلی جنگ عظیم کے دوران (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء) اس کو اسلام دوست ہونے کا طعنہ دیا۔ اور اس کو ترکوں کا حلیف کہا۔ کارٹون میں اسے ترکی ٹوپی اوڑھے اور قرآن شریف کا نسخہ پکڑے ہوئے دکھایا جاتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل اس نے ترکوں اور مسلم لیبیا پہ اطالوی جارحیت کی مخالفت کی تھی۔ دورانِ جنگِ عظیم اول کائتانی آسٹروی محاذِ جنگ پہ اطالوی توپ خانے کا کمانڈر رہا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں کائتانی نے روم میں "FONDAZIONE CAETANI" (کائتانی وقف) کے نام سے ایک وقف کی بنیاد رکھی جسے اطالوی قومی اکادمی ______ (ACCADEMIA DIE LINCEI) سے ملحق کر دیا گیا ہے۔ اور جو تاریخِ اسلام پہ دنیا کی بہترین و نادرِ روزگار لائبریریوں میں سے ایک ہے۔

پرنس لیونے کائتانی نے ۱۹۰۳ء میں روم کے ایک مشہور امیر خاندان ای لورنہ جو ازمنہ وسطیٰ میں کائتانی خاندان کا حریف رہا تھا، شہزادی وِٹوریا کولونہ نامی سے شادی کی تھی، جس کے ساتھ کچھ زمانہ تو کائتانی نے پُرمسرت مناہلانہ گزارا، لیکن پھر وہ ایک اور اطالوی خاتون کی طرف مائل ہو گیا جس کے بطن سے کائتانی کے تین بچے ہوئے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، کائتانی بنیادی طور پر ایک سوشلسٹ اور ڈیماکریٹ تھا۔ مگر ۱۹۲۰ء میں جب مسولینی نے اطالیہ میں اپنی فاشسٹ آمرانہ حکومت قائم کی تو کائتانی کے لیے اطالیہ میں عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور وہ اپنی داشتہ "بیوی" سمیت جلاوطن ہو کر کینیڈا کے مقام وان کور (VANCOUVER) میں آباد ہو گیا۔ اور اس طرح ایک شہرۂ آفاق اور کسی حد تک اسلام دوست نصرانی اطالوی مستشرق سے دنیائے اسلام ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ کائتانی کا انتقال کرسمس ۱۹۳۵ء کی شام کو یورپ کے ایک ہسپتال میں ہوا۔

راقم الحروف کا مشرقی افریقہ میں قیام قریباً تین سال (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء) رہا، جس کے دوران میں راقم پہلے دو سال کمپالا، یوگنڈا، اور پھر ایک سال دارالسلام، تن گن یکا

(حال تنزانیہ) میں رہا۔ راقم اس زمانے میں "مسلم ریویو" لکھنؤ کا معاون مدیر بھی تھا۔ اس انگریزی ماہنامے میں شروع ۱۹۳۴ء میں راقم کا مشہور مضمون "کتب خانۂ اسکندریہ کو کس نے جلایا تھا؟" "WHO BURNT THE ALEXANDRIAN LIBRERY" شائع ہوا تھا، جس کی کائتانی آنجہانی نے دل کھول کر داد دی تھی۔ اور غالباً یہی مضمون راقم کے کائتانی سے تعلقات اور مراسلت کا سبب بنا تھا۔ ذیل میں راقم کائتانی کے کینیڈا سے اپنے نام اُن تین خطوط کا اُردو ترجمہ پیش کر رہا ہے جو کائتانی نے اُس کو جون ۱۹۳۴ء اور ستمبر ۱۹۳۵ء کے درمیان لکھے تھے۔ ان میں سے پہلا (۲۱ جون ۱۹۳۴ء) کا خود کائتانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا (۲۱ جون ۱۹۳۵ء) ٹائپ میں ہے، اور تیسرا اور آخری (۳ ستمبر ۱۹۳۵ء) بھی کائتانی کے ہاتھ سے لکھا ہوا، مگر صیغۂ غائب میں اور نہایت مایوس کن اور دردناک ہے۔

لندن سے شائع ہونے والے نہایت معروف سابق انگریزی ماہنامہ "دی اسلامک ریویو" مارچ، اپریل ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں راقم الحروف کا پرنس کائتانی پر مفصل مضمون مع اس کی تصویر کے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے تین سال بعد اسی ماہنامہ کی نومبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں پروفیسر عبدالاحد داؤد کا وہ مضمون شائع ہوا جو موصوف نے کائتانی کی اطالوی "تاریخِ اسلام" سے ترجمہ کر کے مصر میں سراپس کے مقام پر کتب خانۂ اسکندریہ کی حضرت عمرؓ کے مفروضہ حکم اور عرب مسلمانوں کے ہاتھ سے جلائے جانے کی جھوٹی داستان بیان کی ہے اور جس کی کائتانی نے سختی سے تردید کی ہے۔

کائتانی کے ۳ خطوط ڈاکٹر محمود بریلوی کے نام

(ترجمہ شدہ)

(۱)

۲۱ جون ۱۹۳۴ء

جنابِ من!

مجھے آپ کا ۲۰ اپریل ۱۹۳۴ء کا خط روم (اطالیہ) سے یہاں کینیڈا بھیجا گیا ہے۔

بعض وجوہات کی بنا پر، جن میں سیاسی وجوہ بھی شامل ہیں، مجھے اطالیہ کو خیر باد کہہ کے یہاں کینیڈا میں آکر سکونت اختیار کرنا پڑی۔ اور روم کے کتب خانہ عالیہ میں اپنا تمام کتب خانہ مع مخطوطات کے چھوڑنا پڑا، لیکن مجھے اس امر کا بے حد صدمہ ہے کہ ان ناگزیر حالات کے باعث مجھے اپنی "تاریخ اسلام" کو بھی نامکمل چھوڑنا پڑا۔ بہ ایں ہمہ مجھے تمام اسلامی امور میں گہری دلچسپی ہے۔ مجھے مسلمانوں کی یوروپی نقالی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ نہ معلوم مسلمانوں کو اُن خطرات کا احساس ہے کہ نہیں جو یوروپی دراندازی سے مستقبل میں مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنا چاہیے کیونکہ جس روز سے وہ یوروپی طرزِ حیات کو اختیار کرلیں گے اُس روز سے ان کے اندر اسلامی فکر و عمل کے خاتمے کا آغاز ہو جائے گا......

پیغمبر اسلام نے جس اسلام کی تعلیم دی تھی، وہ کروڑوں انسانوں کے لیے ایک رُوحانی ضرورت ہے۔ بعض اقوامِ عالم، مثلاً ہندوستان کے ہنود کے لیے تو اسلام ایک نامعقول مذہب و طرزِ معاشرت سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر تمام ہندوستان دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے تو وہ دُنیا کی طاقت ورترین اور با اثر اقوام میں شامل ہو جائے گا۔ اِسی لیے مجھے وہاں بہت سے نصرانی تبلیغی اداروں کے مساعی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کیونکہ عیسائیت ہندوستانیوں کے لیے موزوں مذہب نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کو تو اپنی سربلندی کے لیے قابلِ فخر اور باوقار مذہب اسلام اختیار کرنا چاہیے۔

کیا آپ آغا خاں کے متبعین میں سے ہیں؟ یا شیعہ؟ کیا آپ کوئی مبلّغ ہیں؟ آپ کے فرقہ یا عقیدے کا مخصوص نام کیا ہے؟ کیا اب بھی آپ کو اسمٰعیلی کہا جاتا ہے جیسا کہ قدیم تواریخ میں مرقوم ہے؟ مجھے آپ سے مراسلت کر کے اور آپ کا جواب پا کے مسرت ہوگی۔ مجھے میرے کینیڈا کے موجودہ پتہ پر ہی جواب دیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی دراز کرے۔

آپ کا مخلص

لیونے کاسانی دی سرمونیتا

(۲)

۱۴ رجنوری ۱۹۳۵ء

محترمی!

میں آپ کے کرم نامہ اور ماہنامہ "مسلم ریویو" کی اُس اشاعت کے لیے آپ کا ممنون ہوں جس میں آپ نے نہایت تحقیقِ علمی و دیانت کے ساتھ خلیفہ عمرؓ کے حکم سے کتب خانہ اسکندریہ کے مسلمانوں کے ہاتھ سے جلائے جانے کی من گھڑت داستان کی اصل حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ آپ نے مجھ ناچیز کے لیے تعریفی الفاظ استعمال کیے ہیں، میں ان کے لیے آپ کا ممنون ہوں، ہر چند کہ میں ان کا مستحق نہیں ہوں۔ میں نے آپ کا متذکرہ بالا مضمون نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کے لیے میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ مستقبل میں بھی اپنی دیگر تصانیف کی ترسیل سے مجھے نوازیں گے۔ میں ہوں نیک تمناؤں کے ساتھ۔ آپ کا مخلص

ایل کائتانی دی سرمونیتا

(۳)

۳ ستمبر ۱۹۳۵ء

مسٹر ایل کائتانی دی سرمونیتا، ایچ ایچ دی آغا خاں ہائی اسکول، دارالسلام کے ہیڈ ماسٹر کے نہایت دلچسپ خط اور اسکول میگزین کی ایک کاپی کے لیے ان کا نہایت شکرگزار ہے۔

مسٹر ایل کائتانی دی سرمونیتا چند ماہ سے سخت علیل رہا ہے۔ چنانچہ وہ ایک جدید طرزِ علاج کو آزمانے کے لیے یورپ کو روانہ ہو رہا ہے۔ اس کی یہ غیر حاضری طویل ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ اس کا انجام بھی بخیر نہ ہو۔

لہٰذا مسٹر کائتانی بصد ادب و احترام درخواست کرتا ہے کہ جب تک اُس کی واپسی یقینی نہ ہو جائے اُس کو اس کے کینیڈا کے پتہ پر مراسلت کرکے وقت ضائع نہ کیا جائے۔ مسٹر کائتانی ایک مرتبہ پھر تمام عنایات کے لیے اظہارِ تشکر کرتا ہے۔

نوٹ: انگریزی میں لکھے ہوئے یہ تینوں اصل خطوط (جن کا اُردو ترجمہ دیا گیا ہے)، ادارۂ معارفِ اسلامی، منصورہ، لاہور ۱۸ کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

(مدیر)

اصلاحِ معاشرہ کے لیے اسلام کی تدابیر

از طاہرہ شاکر صاحبہ۔ ریسرچ سکالر شعبۂ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

اِس مضمون میں ہم اسلام کی ان تدابیر کا جائزہ لیتے ہیں جن کے ذریعے وہ فردِ معاشرہ کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

۱۔ تطہیرِ عقائد و افکار اسلام توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت کو اصلاحِ معاشرہ کا سنگِ بنیاد قرار دیتا ہے۔ کیونکہ انسان کے اعمال و افعال کا اصل صرف اس کے خیالات و نظریات ہوتے ہیں۔ اور اگر خیالات صالح ہیں تو ان کے زیرِ اثر ہونے والے اعمال بھی نیک اور صالح ہوں گے۔ اور اگر خیالات بُرے اور فاسد ہوں گے تو افعال و اعمال بھی بُرے ہوں گے۔ کیونکہ خیالات کا مبداء اور سرچشمہ دراصل اس کے عقائد ہوتے ہیں جن کے تحت ان کے خیالات و تصورات تشکیل پاتے ہیں۔ اب اگر اس کا عقیدہ صحیح اور ہمہ گیر ہو تو اُس کی زندگی کے تمام افعال اس کے زیرِ اثر وقوع پذیر ہوں گے۔[۱]

یوسف القرضاوی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

"عقلی اور نفسیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے بڑا ذریعۂ اصلاح خود دین ہے۔ کیونکہ اللہ کے وجود پر ایمان، اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان اور آخرت

---

[۱] سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی (لاہور، ۱۹۵۵ء)

کی جزا و سزا کا تعین اتنا مضبوط حصار ہے کہ اس کے بغیر اصلاح و تربیت کا کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور پھر آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے جس طرح تریاق کا کام دیتا ہے اور جس طرح دنیاوی اعمال و افعال پر اثر انداز ہوتا ہے اس کا مقابلہ کوئی اور نظریہ نہیں کر سکتا۔[1]

حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

"ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ یا رسولؐ اللہ۔ میرے کچھ غلام ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں۔ میرے مال میں خیانت کرتے ہیں اور جھوٹ و فریب سے کام لیتے ہیں۔ میں اُن کو سزا دیتا ہوں اور کبھی مارتا ہوں۔ یا رسولؐ اللہ، فرمائیں کہ قیامت کے دن میرا اور ان کا کیا معاملہ ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تمہاری سزا اُن کے جھوٹ و فریب اور نافرمانی کے برابر ہوئی تو نہ تم پر سزا ہو گی اور نہ ہی تمہیں کوئی اجر ملے گا، لیکن اگر تمہاری سزا زیادہ ہوئی تو تم سے بدلہ لیا جائے گا۔ یہ سُن کر وہ ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگا تو آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے سُنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ہم قیامت کے دن ذرّہ بھر بھی ظلم نہ کریں گے اور رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوا تو اُسے سامنے لائیں گے۔ تو یہ سُن کر اس شخص نے کہا کہ میرے لیے بہتر یہ ہے کہ میں ان غلاموں کو آزاد کر دوں، اے اللہ کے رسولؐ گواہ رہیں کہ میں نے ان غلاموں کو آزاد کر دیا۔[2]

تو یہاں خادموں کے ساتھ سلوک کے بارے میں اس کے دل میں آخرت کے یقین نے یہ کھٹک پیدا کی اور اسی خوف نے اس تصور پر آمادہ کیا کہ وہ غلاموں کو آزاد کر دے تاکہ پچھلی زندگی میں جو زیادتیاں ہوئی ہیں یہ عمل اُن کا کفارہ بن سکے۔

---

[1] یوسف القرضاوی - ایمان اور زندگی (لاہور ۱۹۷۸ء)، ص ۳۰

[2] محمد یوسف اصلاحی، اسلامی معاشرہ (لاہور ۱۹۶۸ء) ص ۶۸

۲۔ تہذیب نفس ڈاکٹر تنزیل الرحمن لکھتے ہیں :۔

" اسلام نے اصلاحِ معاشرہ کے لیے جو بہترین طریقہ بتایا ہے وہ نفس کی تربیت ہے۔ جس کا بہترین نظام اس نے عبادات کی صورت میں کر دیا ہے اور اگر فلسفہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی غرض وغایت ہی تہذیبِ نفس، تربیتِ ضمیر اور مومن کی رُوح میں محبت ومودّت پیدا کرنا ہے۔ مثلاً اگر پانچوں وقت کی نماز پورے خشوع کے ساتھ پڑھی جائے تو ارشادِ باری تعالیٰ کے مطابق :

انّ الصّلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر[۱]

یقیناً نماز تمام تر فحش اور ناگوار باتوں سے روکتی ہے۔

روزہ اور زکوٰۃ سرکشی اور علیحدگی اختیار کرنے والے نفوس کا خاص علاج ہے۔ اسی طرح حج روحِ انسانی کو مہذب کرنے والی عبادت ہے۔ اور عام انسانوں میں اُلفت پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے[۲]

۳۔ اخلاقی اصلاح اخلاق حقیقت میں انسانیت کا اصل جوہر اور انسان اور حیوان کے درمیانِ وجہِ امتیاز ہے۔ دُنیا و آخرت میں کامیابی کا دارومدار اخلاق پر ہے۔ کوئی انسان اپنی انفرادی حیثیت میں اور کوئی انسانی گروہ اپنی اجتماعی حیثیت میں اخلاق کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کو استحکام کے لیے کچھ بنیادی اخلاقیات کی ضرورت نہ ہو۔"[۳]

" اسلام اپنے پیروکاروں کے لیے بالخصوص اور پوری دُنیا کے لیے بالعموم جس معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس میں اہم ترین اساس اخلاق کی اصلاح ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلام

۱۔ القرآن الحکیم، ۲۹ (سورۃ العنکبوت) : ۴۵

۲۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمن، جرم وسزا کا اسلامی فلسفہ (راولپنڈی، ۱۹۸۲ء) ص ۴۵

۳۔ حفظ الرحمن سیوہاروی، اخلاق اور فلسفۂ اخلاق (دہلی، ۱۹۶۰ء) ص ۲۱۵

نے اپنی اخلاقی اور قانونی تعلیمات پر بہت زور دیا ہے۔ اور قرآن و سنت میں اس کے تفصیلی احکامات بیان کر کے ان تمام چور دروازوں میں پہرے بٹھا دیئے ہیں، جہاں سے معاشرے کے اندر فحاشی یا بے حیائی کے گھس آنے کا احتمال ہو۔" [۱]

چنانچہ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ نے بالخصوص یہی عنوان بیان کیا ہے اور ان تمام باتوں سے منع کیا ہے جو کہ اخلاقی تباہی کے محرکات ثابت ہوں۔ اور جہاں تک احادیث شریفہ کا تعلق ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مندرجہ ذیل بیان ان محرکات کے خاتمے کے لیے بہت کافی ہے:

"جو شخص مجھے اپنے جبڑوں کے درمیان کی (یعنی زبان) اور ٹانگوں کے درمیان کی چیز (یعنی شرمگاہ) کی ضمانت دے دیتا ہے (کہ اُسے اللہ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کرے گا) تو میں اُس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔" [۲]

مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

"اس حکیمانہ ارشاد نے انسانی معاشرے کی دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دُنیا میں جتنے گناہ اور جرائم سرزد ہوتے ہیں ان کے دو سبب ہیں۔ یہ زبان کی بے اعتدالی جس میں بد زبانی بھی شامل ہے۔ اور پیٹ کی خواہش پوری کرنے کے لیے کیے جانے والے جرائم یا پھر جنسی خواہش کی بے اعتدالی جس میں عریانی اور بے حیائی کے تمام کام آتے ہیں" [۳]

۴۔ بیداری ضمیر | ضمیر کی بیداری بھی اخلاق کا ایک بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر اخلاق کی عظیم الشان عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ زندہ ضمیر اخلاق کی تعمیر و تشکیل کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اور ایک مستعد دربان کی طرح اس کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ محض قوانین

---

[۱] محمد اسماعیل بخاری، صحیح بخاری (مصر ۱۳۴۵ھ)

[۲] ایضاً

[۳] مولانا محمد تقی عثمانی، عصرِ حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو (کراچی ۱۳۹۶ھ) ص ۱۰۷

اور آئینی ضوابط کے بل بوتے پر یا پولیس اور فوج کی قوت سے ترقی و خوش بختی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ حصول سعادت کے لیے بیدار ضمیر اور زندہ قلوب کا وجود ضروری ہے۔ اس لیے اسلام اصلاح معاشرہ کے لیے بیداریٔ ضمیر پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ جب تک دلوں میں خوف خدا نہ ہو، بیرونی خوف کبھی کارگر ثابت نہ ہوگا۔"[1]

اسلامی تاریخ نے اس بیداریٔ ضمیر اور شدتِ احساس کے اتنے نمونے محفوظ کر رکھے ہیں کہ سب کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔ صرف ایک مثال سے خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

"ایک عورت آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتی اور عرض کرتی ہے کہ اے اللہ کے رسولؐ، میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ مجھے پاک کر دیجیے۔ رسول کریمؐ اُسے واپس لوٹا دیتے ہیں، مگر وہ اگلے دن پھر آتی ہے۔ اور کہتی ہے بخدا میں حاملہ ہو گئی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر یہ بات ہے تو تُو چلی جا اور بچّے کی پیدائش کے بعد آنا۔ جب وہ بچے کی پیدائش کے بعد آتی ہے تو آپ فرماتے ہیں: اسے دودھ پلا۔ جب زمانۂ رضاعت گذر جائے تو پھر آنا۔ اس دوران اس بیدار ضمیر خاتون کو دل کی خلش چین نہیں لینے دیتی اور جب مدت رضاعت ختم ہوتی ہے اور بچہ روٹی کھانے لگتا ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم سے اُسے رجم کر دیا جاتا ہے۔"[2]

۵۔ بگاڑ کے محرکات کا خاتمہ اسلام ایسی تمام باتوں مثلاً غیبت، جھوٹ، بدگمانی، دو رخا پن، حسد، چغلی، افواہ، بدزبانی اور وعدہ خلافی وغیرہ کو مکمل طور پر نیست و نابود کرتا ہے، جو کسی برائی کا پیش خیمہ اور محرک ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

یٰایھا الذین اٰمنوا لا یسخر قوم من قوم عسٰی ان یکونوا

---

[1] سید محمد قطب، اسلام کا نظامِ تربیت (لاہور ۱۹۸۰ء) ص ۲۸۱

[2] خلیفہ عبدالحکیم، اسلام کا نظریۂ حیات (لاہور ۱۹۵۶ء) ص ۱۱۰

خیراً منهم ولا نساء من نساء عسى ان يكن خيرا منهن ولا تلمزوا انفسكم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الايمان ومن لم يتب فاولئك هم الظّٰلمون۔ يايها الذين اٰمنوا اجتنبوا كثيراً من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضاً[۱]

"اے ایمان والو ٹھٹھا نہ کریں لوگ ایک دوسرے سے، شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں اُن سے اور عیب نہ دو ایک دوسرے کو، اور نہ ڈالو چڑ ایک دوسرے کی، برا نام ہے گنہگاری پیچھے ایمان کے۔ اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہے بے انصاف۔ اے ایمان والو، بچتے رہو بہت تہمتیں دھرنے سے مقرر بعضی تہمت گناہ ہے اور بھید نہ ٹٹولو کسی کے اور بد نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو۔"

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

"اِن آیات میں ان بڑی بڑی بُرائیوں کا سدِ باب کا حکم دیا جا رہا ہے جو بالعموم ایک معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ درحقیقت یہی وہ اسباب ہیں، جن سے آپس میں عداوتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر اُن سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔"[۲]

۶ - حقوق و فرائض کی نشاندہی | اسلام نے جہاں اصلاحِ معاشرہ کے لیے دوسرے انتظامات کیے ہیں وہاں انسانوں کے آپس کے تعلقات کو بہتر بن اور خوشگوار فضا فراہم کرنے کے لیے تمام رشتہ داروں کے لیے باہمی حقوق و فرائض کی نشاندہی بھی کی ہے تاکہ ہر فرد اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے کسی کے حقوق کو سلب نہ کرے اور نہ ہی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہو کہ آپس میں بگاڑ کے مواقع فراہم ہو سکیں۔ معاشرہ کی مجموعی فضا اور ماحول خوشگوار

[۱] القرآن الحکیم، ۴۹ (سورہ الحجرات): ۱۰-۱۱

[۲] سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (لاہور، ۱۹۸۰ء) جلد ۵ - ص ۸۴ -

رہے اور کسی قسم کی کشمکش پیدا نہ ہو۔"[1]

۷۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسلام دوسروں کی اصلاح پر بھی اتنا ہی زور دیتا ہے جتنا فرد کی انفرادی تربیت پر۔ بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:۔

"ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں بلکہ اجتماعی شر و فساد ہوتا ہے۔ بعض اقوام کے چند افراد انفرادی طور پر تو صالح اور نیکوکار ہوں، لیکن وہ دوسروں کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں تو اجتماعی طور پر شر و فساد ساری قوم کے لیے تباہی و ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔"[2]

اسی سلسلے میں پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی اصلاح اور برائیوں سے اس کی تطہیر کے ساتھ ساتھ دوسروں کی اصلاح اور ہدایت کا کام سرانجام دیں"۔[3]

قرآن وسنت میں بے شمار جگہوں پر اس کے لیے اتنی شدت سے اور تاکیدی احکام آئے ہیں کہ انسان کسی حال میں بھی کسی بھی جگہ پر اس سے کوتاہی نہیں برت سکتا اور اس کے لیے سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا کہ وہ اس فریضے کی ادائیگی پوری کریں۔ جیسا کہ قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیت سے پتہ چلتا ہے:

ولتکن منکم اُمۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر[4]

"تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے کہ خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک

---

[1] سید محمد قطب، "اسلام اور جدید ذہن کے شبہات" (لاہور ۱۹۸۱ء) ص ۱۱۷

[2] سید ابوالاعلیٰ مودودی، تنقیحات (لاہور، ۱۹۸۱ء) ص ۲۰۳

[3] پروفیسر خورشید احمد، "اسلامی نظریۂ حیات" (کراچی، ۱۹۷۹ء) ص ۷۱

[4] القرآن الحکیم، ۳: (سورہ آل عمران): ۱۰۴

کاموں کے کرنے کا کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے "

۸ ـ حدود وقیود | سید محمد قطب فرماتے ہیں :

" جدید معاشرے میں ہر قسم کے بگاڑ و فسادات کی جڑ دراصل ان کی بلا قید و شرط شخصی آزادی ہے ـ جس کی بدولت وہ اپنے ہر قسم کے مفادات کے لیے سرعام ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کر سکتا ہے ـ اور اسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوتا ـ اور ان پر اگر قانون کی کوئی معمولی سی گرفت ہوتی بھی ہے تو وہ ان معاملات میں جن کو حکومت خود ناپسندیدہ خیال کرتی ہو، ورنہ ان کے نزدیک اخلاق نام کی کوئی چیز نہیں لیکن اس کے برعکس اسلام نے جہاں فرد کو جائز قسم کی آزادی اور ہر معاملہ میں جائز خود مختاری دی ہے اور اس کی خواہشات اور میلانات کا اعتراف کر کے اسے لاشعوری اخفاء سے محفوظ کر دیا ہے ـ وہاں اس پر کچھ ناگزیر اور ضروری قسم کی حدود وقیود اور ایسے احکامات و تعلیمات اور تنظیمات کا پابند کر دیا ہے کہ اپنی جائز خواہشات کی تکمیل کے لیے بھی ان حدود کو پھلانگ نہیں سکتا "[۱]

بقول محمد یوسف اصلاحی :

" جہاں تک ان حدود وقیود کا تعلق ہے جو عقیدۂ اسلام میں انسان پر عائد کی گئی ہیں وہ فرد کی آزادی میں مداخلت نہیں، بلکہ فرد اور معاشرے کے حقوق میں توازن کا قیام ہیں ـ ایک شخص اگر بلا روک ٹوک خواہش نفس پوری کرنا چاہے تو بلاشبہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے ـ ایک صاحب اگر کسی کی جیب پر ہاتھ رکھ کر اسے صاف کرنے کا ارادہ رکھیں تو ایسی آزادی کی بھی دین و ایمان میں کوئی گنجائش نہیں فضائل اخلاق کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص رذائل اخلاق اختیار کرتا ہے تو یقیناً اس کی گرفت کی جائے گی زبان کا غلط استعمال، طاقت کا ناروا مظاہرہ اور دولت کا بے جا ضیاع، یہ ایسے کام ہیں کہ جن کے ارتکاب کی اگر کھلم کھلا اجازت دے دی جائے تو معاشرتی زندگی کا

[۱] سید محمد قطب ، اسلام کا نظام تربیت (لاہور، ۱۹۸۰ء) ص ۳۸۱

امن و سکون غارت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"[1]

۹۔ تعزیرات | مولانا مودودی فرماتے ہیں:

"ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد بھی اگر معاشرے میں کچھ ایسے پست فطرت اور خوفِ خدا سے محروم لوگ موجود ہوں کہ ان پر پھر بھی کوئی وعظ و نصیحت اثر نہ کرتی ہو۔ اور وہ کسی طریقے سے بھی اپنے جرم سے باز نہ آئیں تو اسلام ان پر اپنے قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرتا ہے۔ اور ان کے لیے ایسی سزائیں تجویز کرتا ہے۔ جو منصفانہ اور عبرتناک ہوں، کیونکہ اگر ایک شخص پر حد جاری کر دی جائے تو ہزاروں افراد بھی اس سے عبرت حاصل کر کے ان برائیوں کو چھوڑ دیں گے۔"[2]

ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

"کیونکہ سزا ایک طرف تو مجرم کو جرم سے باز رکھنے کا باعث ہوتی ہے اور دوسری طرف غیر مجرم کے حق میں تنبیہ کا سبب ہوتی ہے۔ جرم کے بار بار اور مزید واقع ہونے کو روکتی ہے۔ چونکہ سزا ایسا فعل ہے جس کو حواس محسوس کرتے ہیں اور آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اس لیے اس کی اثر اندازی فعل محسوس ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ معاشرے کو پاک صاف رکھنے کے لئے سزا کا اختیار کیا جانا بدیہی امر ہے۔"[3]

۱۰۔ عفو و درگذر | حدود و تعزیرات کے احکام کے ساتھ اسلام ایسے مجرموں کو جن کے جرم معاف کرنے سے فساد سے زیادہ معاشرتی مفاہمت پیدا ہوتی ہو تو انہیں معاف کرنے اور درگذر کرنے کا حکم دیتا ہے، بشرطیکہ وہ جرم دین کے واضح احکامات کے خلاف نہ پڑتا ہو۔

---

[1] محمد یوسف اصلاحی، اسلامی معاشرہ، (لاہور۔ ۱۹۶۹ء)، ص ۱۷۷

[2] سید ابوالاعلیٰ، رسائل و مسائل، (لاہور۔ ۱۹۸۱ء) ص ۲۷۳

[3] ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، جرم و سزا کا اسلامی فلسفہ (راولپنڈی، ۱۹۸۲ء)، ص ۵۰

وگرنہ اس میں حد جاری کرنا شریعت کی رُو سے ناگزیر ہے[1]
اس کی بہترین مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قائم کردہ ہے کہ انہوں نے اپنے بڑے بڑے دشمنوں سے بھی درگذر فرمایا اور فتح مکہ کے موقعہ پر یہ فرما کر سب کو معاف کر دیا کہ لا تثریب علیکم الیوم - خود قرآن میں آتا ہے، اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ[2]
(ترجمہ) بُرائی کا جواب اچھائی سے دو۔
اس کے علاوہ اسلام جرم و فساد کی اشاعت کی مخالفت کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ دیکھا دیکھی اس کا ارتکاب نہ کرنے لگیں۔ الغرض اسلام اصلاحِ معاشرہ کے لیے جو تدابیر اختیار کرتا ہے وہ ہر لحاظ سے تمام نظاموں سے افضل و بہتر اور فوقیت کی حامل ہیں۔

نوٹ: آخر میں مآخذ اور حوالہ جات کی فہرست درج تھی، لیکن وہ اس لیے درج نہیں کی جا رہی کہ صفحہ بہ صفحہ حواشی میں حوالے موجود ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حاشیوں میں درج متعدد حوالے درست نہیں ہیں۔ (ایڈیٹر)

---

[1] سید محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات (لاہور، ۱۹۸۱ء) ص ۲۱۰

[2] القرآن الحکیم، ۴۱ (سورہ حم السجدۃ) : ۳۴

رسائل و مسائل

اسلامی نقطۂ نظر سے انتخابی پالیسی

سوال:۔ حلقہ ہائے خدمت صوبہ پنجاب نے سیاسی پالیسی کے طور پر دو اصول وضع کیے ہیں جنہیں اپنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ پہلا اصول تو یہ ہے کہ الیکشن صرف جیتنے کے لیے لڑا جائے، ہارنے کے لیے نہ لڑا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نشانے کو سر کرنے کے لیے قابلِ قبول لوگوں کو اپنا لیا جائے اور زیادہ تر ٹکٹ اُن لوگوں کو دیے جائیں جو اپنے اخراجات خود برداشت کریں اور با وسائل ہوں۔

اس فارمولا پر پچھلے بلدیاتی انتخابات میں کچھ عمل سرگودھا میں ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارا پختہ یا اپنا آدمی کسی سے کوئی کامیاب ہی نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ہم نے اپنی توجہ قابلِ قبول لوگوں پر مرکوز رکھی۔ جو "قابلِ قبول" جیت گئے اُن کا حال یہ ہے کہ انہوں نے ہماری ایک نہ سنی، کوئی کسی گروپ کے ساتھ چلا گیا اور کوئی کسی گروپ کے ساتھ چلا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ہم اس بد قسمت مرغی کی طرح دیکھتے رہے جس کے نیچے سینے کے لیے بطخوں کے انڈے رکھ دیئے جائیں۔ جب بچے نکل آئیں تو وہ جوہڑ میں چلے جائیں اور مرغی کنارے پر کٹاں کٹاں کرتی پھرے۔

میرے خیال میں یہ پالیسی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اور بے صبری دکھاتے ہوئے بنائی گئی ہے کہ لوگ ہمارے اسلامی حلقوں کے لوگوں کو ووٹ نہیں دیتے اور مجھے ڈر ہے کہ اگر اس پالیسی کو تسلسل دیا گیا تو ایک اور مسلم لیگ بن کر ہو سکتا ہے کہ جماعت حکومت تو حاصل کر لے، اگر وہ مقصود، صالح انقلاب نہ لا سکے گی۔

اس کے علاوہ ہمارے پرانے لوگ کچھ مایوس سے نظر آنے لگے ہیں۔ کیونکہ یہ پروپیگنڈا ہمارے اندر شروع ہو گیا ہے کہ ان پیسے والے لوگوں کو ساتھ ملائے بغیر انتخاب نہیں جیتا جا سکتا۔ چنانچہ دعوتِ عام دینے کی بجائے اب مخصوص دائرے اور حلقے تجویز کیے گئے ہیں جن میں الیکشن لڑنے کے خواہش مند اور با استطاعت لوگوں سے ملاقاتوں کو اولیت دی جا رہی ہے۔

میرے خیال میں اسلامی طریقِ انقلاب کی طرف سے نظر ہٹ گئی ہے۔ کیونکہ وہاں انقلاب کا سب سے بڑا ہتھیار باکردار لوگ اور زوردار طریقہ سے دعوت کا پہنچانا ہے جس سے رائے عامہ اس حد تک متاثر ہو جائے کہ وہ نہ کسی لالچ دینے والے کے لالچ میں آئے اور نہ ہی کسی ڈرانے والے سے ڈرے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر تو کھمبے بھی جیتتے ہیں۔ خود مسلم لیگ کا تجربہ یہ ہے کہ جب وہ جیتی تو بعض مقامات پر اس کے کھمبے بھی جیتے۔ پی پی پی کے ساتھ بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہوا۔ خود حضورؐ کے ساتھ جنہوں نے جان و مال کی قربانی دی وہ اہلِ نظر میں سے تھے نہ کہ اہلِ ہوس و اقتدار میں سے۔ بہرحال اس سلسلہ میں پالیسی کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ ترجمان القرآن ہمیشہ سے ایسے معاملات میں اسلامی نقطۂ نظر سے رہبری کرتا رہا ہے اس لیے امید ہے کہ اس سلسلہ میں بھی وضاحت اور رہبری کی جائے گی۔

جواب: ہمارے لیے ہر ایسا موقع بڑا مقامِ مسرت ہوتا ہے، جب ہمارے قارئین اور حلقۂ ترجمان القرآن کے رفقاء میں سے کوئی کسی امر میں پرخلوص جذبۂ اسلامی سے اضطراب دکھاتا ہے اور اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اسے کسی طرف سے صحیح روشنی ملے۔

ویسے اجتماعی و سیاسی معاملات ایسے پیچیدہ ہوتے ہیں اور اتنے مختلف پہلو رکھتے ہیں کہ بعض اوقات کسی ایک ہی اصول کو سامنے رکھ کر جب کسی قضیے کی جانچ کی جاتی ہے تو صحیح حل ڈھونڈ نکالنا آسان نہیں ہوتا۔ آپ نے جس معاملے پر سوال اٹھایا ہے وہ بھی سادہ اور یک رخا معاملہ نہیں ہے، بلکہ اس کی کئی تہیں ہیں۔ ان سب کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

پالیسی ایک ایسی چیز ہے کہ بسا اوقات اس کو بیان کرنے میں ایک شخص پورے اعتدال کو

ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ اور کسی پہلو یا کسی لفظ پر زیادہ یا کم زور دے کر وہ غلط تاثر پیدا ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی پالیسی کی تشریح و توضیح میں دو یا دو سے زیادہ افراد مختلف اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں اور اس وجہ سے وہ مخاطبوں کے ذہنوں پر اثرات بھی مختلف چھوڑتے ہیں۔

وہی باتیں جو آپ نے خط میں لکھی ہیں اور آپ کے لیے پریشانی کا موجب بنی ہیں، انہی کو یہاں اعتدال و توازن سے بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ مطمئن ہوں گے۔

پالیسی کا برسوں پہلے سے قائم شدہ اُصول یہ ہے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق ہمارا امتیازی کام یہ ہے کہ ہم صالح قیادت کو اُبھاریں اور اسلامی طرزِ فکر اور کردار رکھنے والے ممتاز افراد کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ یہ اُصول اپنی جگہ قائم ہے۔ اور جب تک تحریکِ اسلامی کے اثرات موجود ہیں، یہ اُصول بھی موجود رہے گا، کیونکہ اس کی اساس قرآن و حدیث کی تعلیمات پر ہے اور ہمارے لٹریچر میں اس پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اب اگر ہم اس سے انحراف کریں تو ہم خود اپنے وقار و اعتماد کو ختم کرنے کی بھاری غلطی کریں گے۔

اب آگے چلیے۔ اُصولوں کو قائم رکھتے ہوئے عملی حقیقتوں اور مشکلات کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ سارا کام آنکھیں بند کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ کہا یہ گیا ہے کہ انتخابات میں جیتنے کے لیے لڑنے چاہییں، نہ کہ ہارنے کے لیے۔ اس کا منشا یہ نہیں کہ ہم اپنا متذکرہ بالا اساسی اُصول ختم کر دیں۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہم آنکھیں بند کر کے انتخابات کا معرکہ نہ لڑیں کہ جیتنے کا امکان چار کے لیے ہو تو ہم سَو آدمی کھڑے کر دیں، درآنحالیکہ مخالف موافق سب جانتے ہوں کہ ان کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بار بار اس طرح کے تماشے دکھانے سے لوگوں میں مایوسی پھیل جاتی ہے۔ اور پھر ہماری انتخابی مہمات میں ساتھ دینے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صاف کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو تو ہارنا ہی ہے۔ لہٰذا ووٹ ضائع کیوں کیا جائے۔

اِن اشارات کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے لیے صرف ایسے حلقے چُن لیں جن میں تحریکی کارکنوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہو اور عوام و خواص میں حمایت و تائید بھی پائی جاتی ہو

اور ان حلقوں کے لیے اپنے اندر سے ایسے افراد کو ڈھونڈ کر اُمیدواری کے لیے لانا چاہیے جو فی نفسہٖ مدبر اور نیک نہاد بھی ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی طرف لوگوں کا رجوع نسبتہً زیادہ ہو یا یہ کہ وہ مختلف عوامل کے زیراثر زیادہ سے زیادہ تائید وحمایت حاصل کر سکیں۔ ایسے حلقے یا افراد اگر پورے صوبے یا ملک میں دس بیس (یا کم وبیش) بھی لیے جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ سو ڈیڑھ سو حلقوں میں اُمیدوار کھڑے کیے جائیں اور آخر میں نتیجہ مایوس کن ہو۔

میرا خیال ہے کہ انتخاب "جیتنے کے لیے" لڑنے کا یہی مقصود ہے۔

دوسرا پہلو پالیسی کا یہ ہے کہ جن حلقوں میں ہمیں انتخاب میں خود حصہ نہیں لینا ہے ان میں سے جہاں کہیں ہماری کچھ بھی انتخابی قوت اور حلقہ ہائے اثر موجود ہوں (مگر وہ اس کے لیے کافی نہ ہوں کہ براہِ راست ہم خود حصہ لے سکیں) وہاں کسی محبِ اسلام، شریف اور قابل آدمی کو تائید بہم پہنچا دی جائے تا کہ وہ ایوان میں اور دوسرے دفتری معاملات میں ہمارے ساتھ تعاون کر کے مخالفِ اسلام، بدکردار اور بے بصیرت لوگوں کی قوتوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ جہاں کہیں جس کسی جاگیردار، لٹھ مار، شرپسند اور کھلم کھلا ناجائز ذرائع سے کام لینے والے کسی آدمی کی جیت کے امکانات ہوں وہاں اپنے سارے اصول ومعیار کو بالائے طاق رکھ کر اس کی حمایت کر دی جائے اور اس کا جھنڈا اُٹھا کر اس کے لیے نعرے لگائے جائیں۔

بس یہی وہ نکتہ ہے جس کے بارے میں یا تو کسی اندازِ بیان یا اندازِ تحریر میں کوئی جھول رہ گیا ہوگا۔ اور یا آپ نے مدعا کو اچھی طرح سمجھا نہیں ہوگا۔

"ہارنے کے لیے انتخاب لڑنا" ٹھوک کے حساب سے ہم کہہ چکے ہیں اور اب تجربے نے بتایا کہ محتاط روش ہونی چاہیے۔ مگر اس کے باوجود اب بھی بعض جگہوں پر ہارنے کے لیے انتخاب لڑنا ضروری بھی ہوسکتا ہے۔ یہ ایسے حلقے ہیں جہاں ہم اپنے آپ کو اور اپنے کسی نئے آدمی کو سیاسی حیثیت سے پبلک کی نگاہوں میں لانا چاہتے ہیں اور مستقبل کے لیے جیت کا راستہ بنانا چاہتے ہیں۔

رہا اپنے اخراجات خود برداشت کرنے والوں کے لیے ترجیح کا معاملہ، سو اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ بصیرت و کردار کو بالکل بالائے طاق رکھ کر اصحاب دولت کو تلاش کیا جائے۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ خود ہمارے ہی آدمیوں میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو اسلامی بصیرت و کردار بھی رکھتے ہوں اور مصارف بھی زیادہ سے زیادہ حد تک برداشت کر سکیں۔ جہاں ہماری مالی حیثیت بالکل ساتھ نہ دے، وہاں ہم بے نتیجہ انتخابی جد و جہد کی ذمہ داری قبول نہ کریں۔ ہاں اگر اپنے دائرے کے باہر کا کوئی موزوں اور صاحب حیثیت آدمی سامنے آئے تو اس سے گفت و شنید کر کے اس کی حمایت اس مقصد کے لیے کریں کہ وہ دین و ملت کے لیے بہتر سیاسی کردار ادا کرے گا۔

آپ نے "سرگودھا کی مرغی" کی جو مثال دی ہے، اس طرح کی غلطیاں اور بھی کئی جگہوں پر ہوئی ہیں۔ بعض جگہ اپنا کوئی آدمی بھی نہیں اور محض ہم دوسروں کے لیے دوٹوں کی سستی مارکیٹ بن گئے ہیں حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ انتخاب کے نتیجے میں اپنے دو تین افراد کا ایک مرکزی وجود بن جائے اور پھر جن لوگوں کی حمایت کی گئی ہو، ان کو اس مرکزی وجود کے گرد سمیٹا جائے۔ یا کم سے کم اہم معاملات میں ان کی تائید حاصل رہے۔ ایوان میں اپنا وجود اگر صفر ہو تو محض دوسرے متفرق اصحاب سے نہ کام لیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو کسی ایک نقطے پر سمیٹا جا سکتا ہے۔ وہ لازماً بکھر جائیں گے۔ بعض جگہوں پہ اکا دکا ایسے افراد بھی ہمارے دوستوں کی جوشیلی حمایت سے کامیاب ہو گئے جو ہمارے معیارات کے لحاظ سے "بفر ڈویژن" میں بھی نہیں آتے، بلکہ صریحاً غلط ساخت کے ہیں اور بہت خراب ریکارڈ رکھنے کی وجہ سے بدنام ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہوا کہ بلدیاتی انتخابات میں کسی کسی مقام پر تھوڑی سی قوت حاصل ہو جانے پر کسی بڑے ہاتھی سے ٹکر لینے کا کھلا کھلا اعلان کر دیا گیا۔ اور بعد میں وہ کچھ بھی نہ مل سکا جس کا ملنا آسان تھا۔

مگر ان غلطیوں سے گھبرانے کی بجائے ہمیں ان سے سبق لے کر اپنے لائحہ عمل کو درست کرنا چاہیے اور تدریجاً اس طرح آگے بڑھنا چاہیے کہ ہمارے اہم اصول ٹوٹنے نہ پائیں۔

میں یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بڑے بڑے لوگوں کے حلقوں میں جانے اور خاص خاص شخصیتوں سے رابطہ بڑھانے کی تدبیریں وقتی ضرورت کے تحت اگر جاری رکھی بھی جا سکتی

ہوں تو پھر بھی اُصولاً ہماری تحریک انتخابی لحاظ سے اس وقت ہی با اثر اور با وقعت بنے گی جب کہ ہم لوگ اپنی دعوت کو بہترین پیرایوں سے شخصی طور پر عوام کے اندر پھیلانے کی زوردار مہم چلائیں گے۔ انتخابی یا انقلابی دونوں کی قوتوں کے حصول کا اصل راستہ یہی ہے۔ یہ کام اگر ہم نہ کریں تو ارباب دولت و اثر کی دستگیری سے اکا دکا صورتوں میں کامیابی ہو جانے کے باوجود ہماری قوت نہیں بڑھے گی۔

اور میرا آخری نکتہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے دلوں کو اپنے لیے حصول اقتدار کی ہوس سے بالکل خالی کر لینا چاہیے۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ ہمیں فلاں وزارت مل جائے اور اتنا حصۂ اقتدار حاصل ہو جائے، بلکہ محض اللہ کی رضا اور غلبۂ اسلام کے لیے ہمیں انتخابات کی راہ میں دین اور تحریک کے اُصولوں کو توڑے بغیر مزدوروں کی طرح سخت محنت کرنی چاہیے۔ اس مخلصانہ نیت سے کیے ہوئے کام کو اللہ تعالیٰ کبھی ضائع نہ کرے گا۔ ہاں عملی حالات و مشکلات کے پیش نظر پورے تدبر سے کام لے کر مناسب تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ یہ بھی خود دینی تعلیم کا تقاضا ہے۔

(نعیم صدیقی)

(بقیہ قرآن مجید میں تکرار واقعات کی حکمت و افادیت)

اس حیات مستعار کی ظاہری زینت پر ریجھ کر منعمِ حقیقی کی نافرمانی اختیار کر لینے پر انتباہ کیا گیا ہے تو کہیں آدم کی طرح ہدایت پر ثابت قدم نہ رہنے اور خدا سے باندھے ہوئے عہد کو فراموش کر دینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کسی مقام پہ آدم کی طرح اس کا بندہ بن کر نہ کہ شیطان کی طرح سرکش و نافرمان بن کر رہنے پر زور دیا گیا ہے۔

۸ــــ قصہ آدم و ابلیس کے تکرار و اعادہ میں مضمر مذکورہ بالا حِکم کے علاوہ ایک ابدی حکمت جو کار فرما نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو یاد دلایا جائے کہ وہ کتنا عظیم، خدا کے ہاں کتنا مکرم و محترم ہے نیز یہ کہ اُسے اپنے ازلی دشمن ــــ شیطان ــــ سے جو منبعِ شر ہے، کے نقشِ قدم کی پیروی سے ہمیشہ گریز کرنا لازم ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

مطبوعات

ISLAM & WORLD RELEGIONS مولفہ جناب ڈاکٹر پروفیسر محمود بریلوی۔ ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ انگریزی زبان اور باریک ٹائپ میں ۳۲۰ + ۱۱۱ا صفحات کی مجلد کتاب۔ قیمت درج نہیں۔

اُردو میں ہم اس کتاب کو اسلام اور مذاہبِ عالم کہہ سکتے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں کراچی سے جناب مؤلف نے خود شائع کرایا۔ اب نیا ایڈیشن بعض نئے اعداد و شمار اور ترمیمات کے ساتھ مئی ۱۹۸۳ء میں سامنے آیا ہے۔ ۴۰ صفحات کے دیباچے میں کتاب کا اچھا انعکاس موجود ہے۔ گو اس موقع پر تخلیقِ آدم کی بحث کے سلسلے میں نظریہ ارتقاء اور کرۂ ارضی کے ادوار اور ظہورِ حیات کے موضوع پر بڑی تفصیل دی گئی ہے۔ مگر پڑھنے والے کے سامنے یہ بات نہیں آتی کہ یہ بے خدا مادیت کے نئے مذہب کا ایک باب ہے، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ حقیقت ہے۔ حالانکہ اس خطرناک نظریے نے انسان کے حیوانی تصور کی بنیاد پر تمام جدید علوم و نظریات کو استوار کر کے زمین کو بگاڑ سے بھر دیا ہے۔

دوسرے مذاہب سے متعلق بحث ۸ ابواب میں پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۔ ہندو مذہب، اس کی بُت پرستی، فلسفہ وحدتِ وجود اور تثلیثی تصور بیان ہوا ہے۔ پھر اس میں اصلاحی تحریکیں اور ردِّ عمل، جین مت، بُدھ مذہب اور سکھ دھرم کا ظہور۔ ۲۔ بُدھ مذہب اور اس کی شاخیں۔ (لاما ازم وغیرہ) بُدھ مت کی اصل لا ادریت تھی مگر مغرب میں اس نے "ادریت" کا پیرایہ اختیار کر لیا۔ اور چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت کا حریف رہا۔ ۳۔ تاؤ ازم (TAOISM)، اس کی فلسفیانہ بنیاد، دورِ ساحری اور تثلیث کا رنگ۔ ۴۔ کنفوشس CHUNG-FU-TZE کا مذہب

۵- شنتو مذہب جو جاپان کی آبا پرستی پر مشتمل تھا - ۶ - زردشت کا مذہب جسے مجوسیت بھی کہتے ہیں اور جس سے موجودہ پارسی مذہب کا رشتہ بھی ملتا ہے - ۷ - یہودیت اور اس کی نئی صورت صیہونیت - ۸ - عیسائیت جو رومن کیتھولک، گریک کیتھولک اور پروٹسٹنٹ شاخوں پر مشتمل ہے - مؤلف نے زیادہ انحصار امریکی مصنف (NOSS) کی کتاب (MAN'S RELEGIONS) پر کیا ہے، مگر مختلف مذاہب کی تفصیلات ان کے اپنے علمبرداروں اور ساتھ ہی ان تمام مذاہب کے پیروؤں کی اعداد و شمار بھی درج کتاب ہیں - متذکرہ تمام مذاہب پر قدیم وثنیات (MYTHOLOGY) کا اثر مختلف صورتوں میں پڑا - فاضل مؤلف نے خدا کے تصور، عمل تخلیق، ظہور آدم اور انسانی کشاکش سے متعلق ہر مذہب کے اوہام و خرافات کو بیان کر دیا ہے - اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کہیں جنس پرستی اور کہیں رہبانیت (ترکِ جنس و جملہ جسمانی محرکات و علائقِ انسانی) کا راستہ اختیار کیا گیا - مختلف انسانوں، انبیاء، بزرگوں اور تصورِ مادریت کے تحت مقدس ہستیوں (مثلاً مریم علیہا السلام) کی پوجا کی گئی (اور یہ سب چیزیں آج بھی جاری ہیں) -

کتاب کا طویل ترین باب نمبر ۹ اسلام کے موضوع پر ہے - اس میں حسب ذیل فصلیں شامل ہیں:

۱- سیرتِ رسول کریم - ۲ - تاریخ اسلام - ۳ - اسلامی تعلیمات کے مآخذ (قرآن و سنت) ۴ - اسلامی نظریۂ حیات - ۵ - عبادات - ۶ - طریقت - ۷ - شریعت - ۸ - اسلام کا سیاسی نظام - ۹ - اسلام کا معاشی نظام - ۱۰ - اسلام میں دعوت کا مقام - ۱۱ - اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کے حقوق و فرائض - ۱۲ - جہاد فی سبیل اللہ - ۱۳ - علوم و فنون کی ترقی میں اسلام کا حصہ - ۱۴ - اسلامی تہوار - ۱۵ - مسلمان کی روزمرہ زندگی -

عام انگریزی داں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم اور مسلم حضرات کو اسلام کے بارے میں اس باب سے خاصی اچھی مستند معلومات مل سکتی ہیں، لیکن وسعتِ معلومات کے لحاظ سے مسلمانوں کے لیے ۸ ابواب میں دیگر مذاہب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ خاص طور پر مفید اور ایمان افروز ہوگا -

اسلام کے تعارف کے سلسلے میں معاشرتی انصاف، باہمی رواداری، عقیدہ و عمل کی آزادی، جسم و روح کے تقاضوں کی یکساں اہمیت، انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے یکساں مواقع اور "ہزار سجدوں سے نجات" کی حکمت کو خوب نمایاں کیا گیا ہے -

مغرب اپنے مستشرقین کے ذریعے اسلام کو صدیوں سے نہایت تلخ تنقید کا ہدف بنائے ہوئے ہے۔ مخالفین کی زہریلی ذہنیت کا جواب جناب محمود بریلوی نے شیخ حسن البنّا شہید کے ایک خطبے کے طویل اقتباس کے پیرائے میں دیا ہے (ص ۳۰۹ تا ۳۱۲)۔ الاخوان المسلمون کے اس قائد نے مغربی معاشرت کے دیوالیہ پن اور اس صدی کی دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اضطرابات اور انقلابات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ دانشورانِ مغرب کو صرف یہ اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام کی ابدی صداقتیں پوری نوعِ انسانی کے لیے باعثِ فلاح ہیں، موجودہ تہذیب و ترقی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دے گا۔

یہ ایک افسوس ناک مغالطہ ہے، مسلمان مجہول عقیدوں اور اوہام پر یقین نہیں رکھتے، ان کا عقل و شعور کے ساتھ ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین کے ذریعے نظامِ وحی کے تحت صراطِ مستقیم کی رہنمائی دی ہے۔ اور صحیح انسانی فکر جتنے بھی مثبت اور مفید اصولِ معاشرت دریافت کر سکی ہے، اسلام میں کوئی چیز ان کے خلاف نہیں پڑتی۔ صرف ایک بات کھٹکی - دیگر مذاہب پر جو اعتراض کئے گئے ہیں ان میں سے بعض اسلام کے خلاف بھی اٹھائے جا سکتے ہیں۔

یہ کتاب تقابلِ ادیان کے سلسلے میں نصابی حیثیت سے بھی بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اساتذہ اور طلبہ توجہ کریں۔

سفرنامۂ ایران | از جناب اسعد گیلانی - ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور۔ خوب صورت طباعت و کتابت، سفید کاغذ و رنگین سرورق۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ قیمت: ۳۰/- روپے۔

جناب اسعد گیلانی میری نگاہ میں نہایت پیاری شخصیت ہیں، وہ دسیوں کاموں کے ساتھ اس تیزی سے کتابیں لکھ کر ان کی اشاعت کا بندوبست کرتے ہیں کہ ایسی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ پھر وہ جس نقطۂ نظر کے علمبردار بن جائیں اس کو ایسے زورِ ادبیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ساری شخصیت کو اسی میں گھلا دیں گے۔ ان کے سیلابِ اظہار کی پیاری موجوں کی کشش ایسی ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اپنا وجود ان موجوں کے حوالے کر دیا جائے اور باقی

سب کچھ ساحل پر چھوڑ دیا جائے۔ پھر وہ دیرینہ رفیق سفر ہیں، میرے ذاتی محب ہیں اور میری مساعی تحریر و تقریر سے ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ ان کی کسی کتاب پر تبصرہ لکھنا آسان نہیں۔

یہ کتاب میرے نزدیک دینی و سیاسی حیثیت کے بجائے اوّلین درجے پر ادبی اہمیت رکھتی ہے اور سفرنامہ نگاری یا بیانیہ تحریروں کے دائرے میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ تو ایک شاندار آبگینہ ہے اور آبگینوں سے لطف اندوز ہونا تو برحق ہے، مگر تنقید کی نگاہ اُن پر ڈالنا زیادتی ہے۔ میں نے اس کتاب کو پہلی خواندگی میں "نظرِ باقی" حیثیت دینے کے بجائے محض ادبی حیثیت سے استفادہ کیا ہے۔

وہ خمینوی انقلاب کے بعد دو مرتبہ سفرِ ایران (اور ایک مرتبہ سفر برطانیہ باہتمام مسلم انسٹی ٹیوٹ ایرانی) سے مشرف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے خود ہی لکھا ہے کہ وہ دونوں مرتبہ انقلابی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے بنائے "چینل" کی پابندی میں ایران اور انقلاب ایران کا جائزہ لے سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری کتاب میں کہیں بھی کوئی ایسا اہم اختلافی نکتہ نہیں مل سکا جو گواہی دے کہ انہوں نے وہاں کے انقلابی نظام اور معاشرہ کے "قشر" کے نیچے بھی نگاہ ڈالی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا بے عیب انقلاب تو کسی پیغمبر ہی کا لایا ہوا ہو سکتا ہے جس کی تصویر اس کتاب میں ملتی ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انقلابِ ایران جیسے بڑے واقعے کو جب اسلامی تحریک کا کوئی مبصر دیکھنے جائے تو اس کے دل و دماغ میں عدل کی ایک ترازو نصب ہونی چاہیے جس کے مختلف مظاہر کو وہ دونوں پلڑوں میں ڈال کر ایک منصفانہ رپورٹ دنیا کے سامنے رکھے اور کہے کہ چاہے اہم تر مقاصد کے لیے ہم ایران کے انقلاب کے کتنے ہی بڑے حامی کیوں نہ ہوں، مگر ہم تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کے لیے دونوں آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم تمام حامیوں اور مخالفوں سے مختلف ہیں۔

اگر ہم نے اپنے اس مقامِ وسط کو اختیار نہ کیا اور کچھ لوگ خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے ایرانی انقلاب کا پُرزور پروپیگنڈا کرنے میں لگ گئے اور کچھ لازماً جوابی راہ بھی اختیار کریں گے تو یک طرفہ پن یا "انتہا پسندی" کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری صفیں بھی ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ جائیں گی۔ عجب کہ بعض

مسلم ممالک کی اسلامی تحریکوں میں محدود پیمانے پر یہ حادثہ ہو چکا ہے۔ پھر کیا ہمارے ذہین لوگ بھی یہاں یہی چاہتے ہیں۔ ہمارے اندر بھی انقلابِ ایران واقع ہو جائے۔ انقلابِ ایران کے ائمہ تو یہی چاہتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی بغیر کسی کے خلاف "احساسِ رقابت" کے، واضح رہنی چاہیے کہ اس دور میں "اسلامی انقلاب" کا تصور سب سے پہلے مولانا مودودیؒ نے دیا اور اس کے منتہا اور مراحل پر تفصیلی بحثیں کی، اس کے لیے کارکنان کی قوت جمع کی، اس کی تربیت کی اور حقیقی اسلامی انقلاب کی علمبردار یہی قوت ہے۔ دنیا کے ہر ایسے انقلاب کو جو اسلامی کہلائے اسی تصور کی کسوٹی پر جانچنا لازم ہے۔ کیونکہ اس کے ہر جزو کے لیے کتاب و سنت سے برسوں تک استدلال اور مشوروں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ نہیں کہ جہاں کہیں ہم سے مختلف حالات میں کسی قسم کا کوئی اسلامی انقلاب واقع ہو جائے اور اس کے کچھ اچھے پہلو نمایاں ہوں۔ وہ لازماً پورے کا پورا معیاری اسلامی انقلاب ہو۔ اس کے آبِ زلال میں کچھ دُردِ تہ نشین بھی ہو سکتی ہے۔ زیرک و مدبر وہ ہے جو آبِ زلال کی قدر بھی کرے اور "دُردِ تہ نشین" کو آبِ زلال کی ضد بھی قرار دے۔ دنیا میں بڑی مصیبت جمع اضداد ہے۔ اس کا تجزیہ کسی بھی صاحبِ دماغ پر فرض ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ایران کے مخصوص حالاتِ دنیا میں کہیں بھی نہیں ہیں اور پاکستان میں تو بالکل دوسرا ہی نقشہ ہے۔ مولانا مودودیؒ نے یہاں کے حالات کو خصوصاً ملحوظ رکھا ہے۔

یہ بات تو درست ہے کہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ایرانی انقلاب کے عمل کے دوران میں وہاں کے باشندوں کی مظلومیت اور شاہ کی جبریت کو بڑے کرب سے محسوس کیا، اور امام خمینی کے بعض اعلانات سے ان کے اندر کچھ حسنِ ظن بھی پیدا ہوا۔ مگر بعد کے واقعاتی نقشے کو دیکھ کر مولانا رنجیدہ بھی رہے کیونکہ امیدوں کی بلندی سے گرنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا کے نام اور حوالے کے استعمال میں ہمیں بے حد محتاط ہونا چاہیے۔ پھر ہم جو چاہیں اپنی جانب سے کہیں۔

ایرانی انقلاب کا یہ نعرہ کہ " لَا شِیْعَةٌ وَلَا سُنِّیَّةٌ " جو آج تک جاری ہے کیا حقیقت اسی کے مطابق ہے؟ اسعد صاحب کی گواہی اس کے خلاف ہے۔

مگر جونہی اسعد صاحب کی پیاری شخصیت اور اُن کی پُر زور ادبیت سامنے آتی ہے، جی چاہتا ہے کہ متذکرہ ساری باتوں کو ان پر قربان کر کے اُن کی ہر بات کو شرح صدر سے مان لیا جائے۔

اتفاق سے ان دنوں متعدد کتابیں انقلابِ ایران کے متعلق میرے پاس آگئیں اور جناب خمینی اور کلیم صدیقی سے لے کر محمد حسنین ہیکل اور اختر کاشمیری تک کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کسی آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ تعالیٰ مجموعی حاصلِ مطالعہ عرض کر سکوں گا۔

(بقیہ حکمت سید مودودیؒ)

اور پرہیزگاری اس کو سمجھتے ہیں کہ دُنیا کے معاملات ہی سے پرہیز کریں، اور دوسری طرف ساری دُنیا کے کاروبار بدوں کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر کبھی آتا بھی ہے تو صرف خلقِ خدا کو دھوکہ دینے کے لیے۔ اِس خرابی کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و صاف سے آراستہ بھی ہو اور اس کے ساتھ دُنیا کے معاملات کو دُنیا داروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دُنیا داری ہی میں اپنی مہارت و قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک صالح گروہ کو منظم کر لیا جائے، بداخلاق اور بے اُصول لوگوں کے لیے دُنیا کی چراگاہ میں بس اُسی وقت تک چرنے چگنے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا، اور جب ایسا گروہ تیار ہو جائے گا تو آپ یقین رکھیے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی بلکہ بتدریج ساری دُنیا کی سیاست اور معیشت اور مالیات اور علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اسی گروہ کے ہاتھ آجائیں گی اور فساق و فجار کا چراغ ان کے آگے نہ جل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوگا۔ لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ یہ انقلاب بہر حال رُونما ہو کر رہے گا۔ بشرطیکہ ہم صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔

(دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات۔ ص ۴۶ تا ۵۰)

تفہیم القرآن

جلد پنجم

جو کہ ایک عرصے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب دوبارہ چھپ
چکی ہے۔ قارئین کرام اپنے آرڈر پیشگی بک کرا سکتے ہیں۔

ادارہ

ترجمان القرآن لمیٹڈ

دربار مارکیٹ (میلارام)، لاہور